قُرَّةُ العَین

یکے از تصنیفات

علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

خانۂ حکمت ○ ادارۂ عارف

فہرستِ مضامینِ قُرّۃ العین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱	فہرستِ مضامین	۲
۲	آغازِ کتاب	۴
۳	استنباط	۱۴
۴	تعلیمی سوالات	۲۱
۵	دائرۂ لطیف وکثیف	۲۸
۶	بہشت اور خزائنِ اسرار	۳۵
۷	رحمتِ عالمین	۴۴
۸	سورۂ قیامت کی چند حکمتیں	۵۲
۹	دیدارِ الٰہی	۶۰
۱۰	قرآنِ حکیم = خزینۂ خزائن	۶۷
۱۱	سورۂ عصر کی چند حکمتیں	۷۵
۱۲	لفظ تاویل کی تحلیل	۸۱
۱۳	حضرت موسیٰؑ کے نو معجزات	۸۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱۴	سورۂ عادیات کی چند حکمتیں	۹۱
۱۵	سورۂ قارعہ کی چند حکمتیں	۹۵
۱۶	سورۂ تکاثر کی چند حکمتیں	۹۹
۱۷	تصوّرِ آفرینش ــ خط یا دائرہ؟	۱۰۳
۱۸	پیراہنِ یوسف یا معجزاتی کُرتا	۱۱۶
۱۹	روحانیّت کے مشورے	۱۲۶
۲۰	سب سے عظیم تادیلی راز (عرش)	۱۳۵
۲۱	ضمیمہ: فرشتہ، پری، اور دیو کے بارے میں	۱۴۴

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

آغازِ کتاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم : سورۂ اعراف (۷/۹۶) کے اس حکمت آگین ارشاد میں مومنینِ بالیقین کے لئے بہت سے جواہر اسرار موجود ہیں، ترجمہ : اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے (حقیقی معنوں میں) ایمان لاتے اور پرہیزگار بنتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں (کے دروازوں) کو کھول دیتے (۷/۹۶) اس آیۂ کریمہ کی ایک تاویلی حکمت یہ ہے کہ امامِ زمان صلوٰت اللہ علیہ وسلامہ عالمِ دین کا آسمان ہے، اور اہلِ ایمان کی پاکیزہ روحیں زمین ہیں، اور اسی قانونِ امامت کے تحت دوسری تاویل یہ ہے کہ عالمِ شخصی میں ہر حقیقی مومن اور مومنہ کا سر آسمان ہے، اور پاؤں زمین، چنانچہ اسی طرح دیکھنے والوں نے یقیناً دیکھ لیا ہے کہ باطنی آسمان و زمین کی عقلی، علمی اور روحانی نعمتیں

(برکتیں) عارفین و مومنین کو کس طرح حاصل ہو جاتی ہیں۔

آسمان و زمین کی تاویل یہ بھی ہے: عقلِ کُلّ عرش بھی ہے اور آسمان بھی، اور نفسِ کُلّ کرسی بھی ہے اور زمین بھی، نیز حدود دین کی ترتیب میں ہر اوپر کا درجہ آسمان اور اس سے متصل نچلا درجہ زمین ہے، اور حدود اوپر سے نیچے کی طرف یہ ہیں: عقلِ کُلّ، نفسِ کُلّ، ناطق، اساس، امام، باب، حُجّت، داعی (اور باقی حدود) اس میں عقلِ کُلّ آسمانِ مطلق ہے اور داعی وغیرہ زمینِ مطلق ہیں، لیکن درمیانی حدود (نفسِ کُلّ سے حُجّت تک) ایک طرف سے آسمان ہیں اور دوسری طرف سے زمین۔

قرآنِ حکیم میں آسمان کے لئے کبھی اسمِ واحد آیا ہے، جیسے "سماء" اور کبھی اسمِ جمع، جیسے "سماوات"، جس کا راز یہ ہے کہ امامِ زمان علیہ السّلام ایک ہے، مگر عالمِ شخصی میں اس کے بڑے روحانی ظہورات سات ہیں، اس لئے وہ سماء بھی ہے اور سماوات بھی، حضرتِ امامؑ کے سات ظہورات کا مقصد یہ بھی ہے کہ عارفین چھ ناطقوں اور حضرتِ قائمؑ کی معرفت حاصل کریں، یہی مطلب دوسری مثال میں یہ ہے کہ خدا کے چھ دنوں کو پہچانیں، جن میں اس نے عالمِ دین کو بنایا، اور سنیچر کی شناخت کریں، جس میں اللہ تعالیٰ نے نورِ عرش سے متعلق تمام

امور کو انجام دیا۔

اس کتاب میں بعض ایسے مقالے بھی شامل کئے گئے، جو قبلاً تحریر ہو چکے تھے، کیونکہ علم و حکمت کے اعتبار سے ان کی بہت بڑی اہمیّت بھی ہے، اور کتاب کے مرکزی موضوع سے مطابقت بھی، تاکہ قارئین کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو، قرۃ العین کے آخر میں ایک خاص ضمیمہ بھی ہے، جو حضرتِ حکیم پیر ناصر خسرو قدس کی مایۂ ناز کتاب جامع الحکمتین سے بطورِ تبرّک ماخوذ ہے، جس کا ترجمہ جناب ڈاکٹر فقیر محمد ہونزائی نے کیا ہے۔

وجہِ تسمیۂ کتاب:۔

قُرّۃ العین، جو اس پیاری کتاب کا نام مقرّر ہوا، اس میں ایک عظیم قرآنی راز مخفی ہے، وہ بھید جس میں مفتاحِ سعادت پوشیدہ ہے، اس آیۂ مقدّسہ میں ہے، ترجمہ: اور وہ لوگ جو (ہم سے) عرض کیا کرتے ہیں کہ پروردگارا ہمیں ہماری بیویوں اور ذرّیّت (ذرّاتِ روح) سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا (۲۵/۷۴) یہ دعا ائمۂ طاہرین علیہم السّلام کے لئے خاص ہے، ان کے فرزند دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، جسمانی اور روحانی، پس امامِ اقدس و اطہرؑ کے لئے یہ دونوں

بیٹے آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں، کہ جسمانی بچّے کے ذریعے سے وہ عالمِ دین کا امام ہوجاتا ہے، اور روحانی بچّوں کے توسّط سے عالمِ شخصی کا امام۔

امام کے ظہورات :۔

مقامِ روح اور مرتبۂ عقل پر امامِ عالیمقامؑ کے بہت سے ظہورات ہیں، لیکن اوّلین شرط یہ ہے کہ تم اس کو خدا کا نور اور زندہ اسمِ اعظم مانو، پھر علم و عبادت سے روحانی سفر اختیار کر کے عالمِ شخصی میں داخل ہو جاؤ، اور چشمِ بصیرت سے دیکھو: وہ جبلِ روح تھا، اب عالمِ ذرّ ہو گیا، جس کا ہر ذرّہ ایک آفتابِ عالمتاب ہے، صورِ عشق اس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ آتشِ موسیٰؑ اور طورِ عقل بھی وہی ہے، اس کا مقدّس نور اپنی لاتعداد کرنوں سے لشکرِ ارواح و ملائکہ کا کام کرتا ہے، وہ ہر کامیاب مومن اور مومنہ کا روحانی باپ بھی ہے اور نورانی فرزند بھی، بے حد خوشی کی بات ہے کہ وہ بذاتِ خود مومنین و مومنات کا نامۂ اعمال ہے، وہ عارف بھی ہے اور معروف بھی، وہ اللہ تعالیٰ کے عجائب و غرائب کی ظہورگاہ ہے، اس لئے وہ مظہر العجائب کہلاتا ہے، جب وہ امامِ مبین ہے، تو پھر اس میں کیا نہیں ہو سکتا؟

عالمِ وحدت :-

قرآنِ پاک اپنے حکیمانہ بیان میں اس بات پر زور دیتا ہے کہ خالقِ اکبر نے تمام چیزوں کو جفت جفت بنایا ہے، جفت کے معنی میں نر و مادہ بھی ہیں اور اضداد بھی، پس خدا نے عالمِ وحدت سے عالمِ کثرت کو پیدا کیا، اور دونوں کے درمیان فرق رکھا، تاکہ اس کی روشنی میں عالمِ وحدت کے بھیدوں کا علم ہو سکے، مثال کے طور پر اِس دنیا یعنی عالمِ کثرت میں ہزار آدمی ہزار شکلیں رکھتے ہیں، مگر عالمِ وحدت میں ان سب کو ملا کر ایک شخص بنایا جاتا ہے، جو ہزار شکلوں میں ظاہر ہو سکتا ہے، یہی حال دوسری حقیقتوں کا بھی ہے۔

تاریخی یادداشت :-

یہ بندۂ عاجز و ناتوان خاکِ پائے مومنان کراچی سے بوقتِ سحر ۱۹ جون (۱۹۹۱ء) کو ربّ العزّت کا نام لے کر سفرِ مغرب پر روانہ ہوا، اور اسی روز بفضلِ الٰہی لنڈن میں وارد ہُوا، اور وہاں ارضی فرشتوں کی پُر لطف ملاقاتوں، حضرتِ امام علیہ السّلام کے علم و حکمت کی باتوں، درویشانہ مناجاتوں، اور ایک پیاری کتاب "قرّۃ العین" کی تصنیف میں ایک ماہ کا عرصہ انتہائی مسرّت و شادمانی اور کامیابی

سے گزر گیا، کیونکہ خداوندِ قدوس نے لنڈن میں کچھ قدسیوں کو خزائنِ اسرار بنا دیا ہے۔

الحمدللہ، امریکا کا کامیاب دورہ خانۂ حکمت اور ادارۂ عارف کی تاریخ میں بڑا اہم ثابت ہوگا، یہ حقیر ۱۹ر جولائی ۱۹۹۱ء کو تین ہفتوں کے لئے وہاں پہنچا، اور امام عالیمقام علیہ السّلام کے علمی لشکر نے اِس خاکسار کو اتنی عزّت اور ایسی خوشی دی کہ اس کا بیان لفظوں میں کبھی ہو نہیں سکتا، مہربان دوستوں نے اپنے اپنے آراستہ و پیراستہ اور پُرسکون گھروں میں کمالِ شوق سے علمی مجالس کا اہتمام کیا، جملہ حاضرین آتشِ عشقِ امامؑ میں خوب پگھل گئے، جبکہ مناجاتِ بدرگاہِ قاضی الحاجات ہو رہی تھی، اور جب جب باترنّم لیکچر ہوتا تھا، اور محض علم و دانش کی خاطر بڑے ادب سے سوالات کئے گئے، اور خود ان کی قوّتِ ایمانی کے صدقے سے حیرت انگیز جوابات دیئے گئے، اس بندۂ کمترین پر نورِ امامت کے بے شمار احسانات تھے، اب اور بھی زبردست احسانات ہوئے۔

۱۱ر اگست ۱۹۹۱ء کو میں اور چیئرمین نورالدّین راجپاری ہوائی جہاز پر امریکا سے کنیڈا جا رہے تھے، جب ایڈمنٹن قریب آیا، تو وہاں نورانی خیال میں ایک تاویلی کرامت ہوئی، شاید یہ اس امر کی خوشخبری تھی کہ اس شہر میں بھی بڑی سے بڑی کامیابی

ہونے والی ہے، چنانچہ خدا کے فضل وکرم سے ہمیں اہلِ بیتِ رسولؐ کا بہت سا علمی صدقہ ملا، کیونکہ وہاں چند ایسے مومنین و مومنات کا پروگرام تھا، جن کے پاکیزہ گھروں پر صبح وشام آسمانی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے، انھوں نے ہفتہ بھر علمی ورک شاپ (WORK SHOP) کیا، اور ایسا یقین آتا ہے کہ خداوندِ تعالیٰ نے ان کو دینی دولت سے مالا مال کر دیا، آمین!

۱۸ اگست کو ہم کینیڈا سے واپس امریکا آ گئے، شام نہیں بلکہ رات ہو چکی تھی، عزیزان دور دراز مقامات سے آکر منتظر اور چشم براہ تھے، کیونکہ ان کے روحانی معلّم کو دوسرے دن (۱۹ اگست ۱۹۹۱ء) لندن کی طرف روانہ ہونا تھا، اس لئے خواتین و حضراتِ ادارۂ عارف سب مل کر عزیزم عبدالمجید پنجوانی کے گھر میں الوداعی تقریب کا پروگرام کر رہے تھے، اس پُر رونق محفل میں علمِ امامت کے عاشقوں نے جو کچھ کہا اور جو کچھ پڑھا، اس سے میں گداختہ اور از خود رفتہ ہو کر سجدۂ شکر گزاری میں گیا، اور خاطر خواہ طویل سجدوں میں آنسو بہاتا رہا، کینیڈا میں بھی عزیزوں نے ایسی شدّت سے رُلایا تھا، امید ہے کہ کراماً کاتبین (۸۲/۱۱) نے ہر ہر مجلس کو جیسا کہ بہشت کا تقاضا ہے ریکارڈ کیا ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تعاون و ترجمہ:۔

"کیا تیرا یہ گمان ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے، اور حالانکہ تجھ میں عالمِ اکبر سمایا ہُوا ہے؟" مولا علی علیہ السّلام کے اس مبارک قول کو عشق و محبّت کے ساتھ بار بار پڑھنا چاہیئے، کیونکہ اس میں عظمتِ انسانی کا بنیادی اور نورانی درس ہے، لیکن جن لوگوں کا دل جہالت و نادانی سے تنگ و تاریک ہو چکا ہو، اس میں عالمِ اکبر کیسے سما سکتا ہے، پس یہاں علم کی بہت بڑی اہمیّت ظاہر ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ علم کی طرف ہمیشہ پُرزور توجّہ دلائی گئی ہے، آیئے ہم نیک نیتی اور صاف دلی سے علم کی خدمت کریں، دنیا میں علم و حکمت کی روشنی پھیلائیں، بہت سی خدمات ایسی ہیں، جن کا فائدہ محدود لوگوں کو پہنچتا ہے، لیکن علمی خدمت کا فائدہ لامحدود اور غیر فانی ہے۔

جو عزیزان یہاں جیسے تعاون کر رہے ہیں اور جو حضرات کتابوں کا ترجمہ کرتے آئے ہیں، ان سے قربان ہو جانے کیلئے جی چاہتا ہے، آمین! آپ کو میری بات سے شاید تعجّب ہوگا کہ میں فعلاً تمام عزیزوں سے قربان ہو چکا ہوں جو اس علمی خدمت میں میرے ساتھ ہیں، اسی کا اشارہ وہ نورانی خواب تھا، جو میں نے تاشقورغان (چین) میں دیکھا تھا، جس میں مَیں نے اپنے آپ کو

مذبوح اور سر بُریدہ پایا، یہ ایک بڑا روحانی معجزہ تھا، جس میں کئی اسرار پوشیدہ ہیں۔

دراصل یہ کوئی نیا واقعہ نہیں تھا، بلکہ یہ وہی معجزہ ہے، جو زمانۂ ماضی سے جاری رہا ہے، یعنی خواب میں کسی مومن کا خود کو مردہ دیکھنا، قربانی اور روحانی شہادت کی مثال ہے، جیسے حضرتِ پیغمبرِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: کُلُّ مؤمنٍ شھید۔ یعنی ہر مومن شہید کا درجہ رکھتا ہے، اب اگر بعض مومنین نے خواب میں اپنی موت کو دیکھا ہے، تو ان کو خوشخبری ہے، لیکن علم وعمل کی قربانی پیش کرنے کے لئے ابھی بہت سے مراحل سے آگے گذر جانا باقی ہے۔

آپ سورۂ صافات (۳۷/۱۰۲) میں خوب غور سے دیکھ لیں کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السّلام نے خواب میں اپنے فرزندِ دلبند حضرتِ اسماعیل علیہ السّلام کو ذبح کر ڈالا، بنابریں آپؑ نے بیداری میں اس حکم پر عمل کرنے کے لئے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا ہی تھا کہ خداوندِ عالم نے یہ قربانی قبول کر لی، جبکہ اللہ نے حضرتِ اسماعیلؑ کے لئے ذِبحِ عظیم (۳۷/۱۰۷، معجزۂ عزرائیل) کو فِدیہ یعنی بدلہ قرار دیا، ذِبحِ عظیم کے معنی ہیں ذبح کرنے کا بڑا جانور، جس سے روحِ امامت مراد ہے، کیونکہ اس کی عظمت و بزرگی کا یہ عالم ہے کہ جب منزلِ عزرائیلی میں اس کی قربانی ہو جاتی ہے تو اس سے

بے شمار روحوں کو نجات مل جاتی ہے۔

الفاظِ تشکر:-

مشرق و مغرب میں یہ علمی لشکر میرے نہیں میرے مولا کے ہیں، چونکہ میں مولا کا غلام اور اس لشکر کا خادم ہوں، لہٰذا میں اس غلامی اور خدمت سے بے حد شادمان، اور شکر گزار ہوں۔

شاید بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہوگا کہ ہر گونہ خوشی اس بات میں ہے کہ وہ خودی اور بڑائی کو برقرار رکھیں، اس کے برعکس میں یہ سمجھتا ہوں کہ اصل مسرّت و شادمانی اس امر میں ہے کہ ہم بڑائی اور فخر کے بت کو بار بار توڑ ڈالیں، یہی وجہ ہے کہ میں عزیزوں سے قربان ہو جانا چاہتا ہوں، ان کی دست بوسی اور پابوسی کا خواہشمند رہتا ہوں، اور کہتا ہوں کہ: رُوحی فداکُم! رُوحی فداکُم! یعنی میری رُوح تم سے فِدا ہو!... اس کی تاویل یہ ہے کہ ہم سچ مُچ منزلِ عزرائیلی میں ان سے قربان ہو جائیں، آمین! تاکہ وہ کامل یقین کے ساتھ علمی خدمت میں آگے سے آگے بڑھ جائیں الحمد للّٰہ ربّ العالمین والعاقبۃ للمتّقین۔

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی۔ لنڈن۔

۱۴ صفر ۱۴۱۲ھ/۲۴ راگست ۱۹۹۱ء

اِستنباط

۱۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم : خداوندِ قدّوس کے مُسبّب الاسباب ہونے میں کس مومن کو شک ہو سکتا ہے، وہی تو واحد و یکتا اور برحق خدا ہے جو ہر نیک کام کے لئے کوئی سبب بنا دیتا ہے، چنانچہ گزشتہ چند سالوں کی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ محبت و یگانگت اور اشتیاق کے ساتھ ہمارے عزیزوں نے اِس بندۂ ناچیز و درویش کو لنڈن اور امریکا مدعو کیا، لہٰذا یہ خاکسار کل ہی ۱۹ر جون ۱۹۹۱ء کو لنڈن میں داخل ہوا، اور ربّ العزّت کے فضل و کرم سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا اور ایسی ہی پُرخلوص دعوت فرانس کے دوستوں سے بھی آئی رہی ہے۔

۲۔ ہمارے اس علمی سفر کے رفیقانِ راہ ہر قدم پر علم و حکمت کے عجائب و غرائب کا نظّارہ کرنا چاہتے ہیں، جس کے لئے ہم سب

کو دعا کی بے حد ضرورت ہے، اور دعا بھی عام نہیں، خاص ہو، جو پاکیزہ گریہ وزاری اور فنا پر منتج ہونے والی مناجات کی حیثیت میں ہو سکتی ہے، اس کے بغیر نورِ علم کی روشنی سے ہم کیسے مستفیض ہو سکتے ہیں۔

۳۔ قرآنِ حکیم کے جن مبارک الفاظ میں کلیدی قسم کی حکمتیں پوشیدہ ہیں، اُن میں سے ایک لفظ یَسْتَنْبِطُوْن (۴/۸۳) ہے، جس کے مستعمل معنی ہیں: وہ تحقیق کرتے ہیں، اسی سے "اِستنباط" کی اصطلاح بنی ہے، اب ذرا اس کے اصل معنی کو بھی دیکھیں، جس کی غرض سے کوئی مستند لُغاتُ القرآن پیشِ نظر ہو، یا حدُّ القاموس (LEXICON) جلد ہشتم کو دیکھ لیں، کہ اِستنباط کے معنی ہیں کنُوّاں کھود کر پانی تک پہنچنا اور پانی نکالنا، کسی چیز کو کاوش کے بعد برآمد کرنا، مثلاً: اِسْتَنْبَطَ الفقیہ (فقیہ نے اِستنباط کیا) یعنی اجتہاد سے کسی مسئلہ کا استخراج کیا۔

۴۔ "اِستنباط" کا ذکر اگرچہ قرآنِ کریم کی صرف ایک ہی آیۂ مقدسہ میں آیا ہے، اور وہ پاک جگہ سورۂ نساء (۴) کی آیت ۸۳ ہے، لیکن یہ پُر حکمت لفظ صاحبانِ امر سے متعلق ہو کر اپنی معنویت میں قرآنِ پاک کے شروع سے لے کر آخر تک پھیل جاتا ہے، کیونکہ "اِستنباط" تحقیق کرنے سے عبارت ہے، یا بجا طور پر غور و فکر کرنے کا نام ہے، یا یہ خود حکمت اور تاویل ہی ہے، یا اس کو آیت

کا باطن کہنا چاہیئے، بہ ہر معنی استنباط قرآنِ کریم کے ہر مقام پر موجود ہے۔

۵۔ چونکہ معنوی گہرائی صرف قرآن و حدیث ہی میں ہے، لہٰذا "استنباط" کا تعلق خدا اور اس کے رسولؐ ہی کے کلام سے ہے، جیسے کہا گیا ہے: اِستَنبَطَ الفقیہُ ھٰذِہِ المسئلۃ مِن تِلکَ الآیۃ (فقیہ نے اس آیت میں نظر و فکر کر کے اس سے یہ مسئلہ استخراج کیا) ملاحظہ ہو: قاموس القرآن ص ۷۱، اور لغات القرآن، جلدِ ششم ص ۲۴۶ - ۲۴۷، از مولانا محمد عبدالرشید نعمانی۔

۶۔ زیرِ بحث آیۂ شریفہ کا ترجمہ یہ ہے: اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر آئی تو اسے مشہور کر دیتے ہیں (حالانکہ) اگر وہ اس خبر کو رسولؐ اور اپنے صاحبانِ امر تک پہنچاتے تو جو لوگ ان میں سے اس کی تحقیق کرنے والے ہیں (یعنی حدودِ دین) اس کو سمجھ لیتے (۴/۸۳) اس کا حکیمانہ اشارہ یہ ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلعم اور اولوالامر کے لئے مومنین کا قلبی اقرار و ایقان ہونا چاہیئے، تاکہ ان کو امامِ وقتؑ اور جسمانی و روحانی حدود سے استنباط کا فیض حاصل ہو، کیونکہ اس ارشادِ ربّانی میں دو دفعہ مِنھُم کا لفظ آیا ہے، جس میں پہلے صاحبانِ امر کے لئے ہے، اس کے بعد ذیلی حدود کے لئے، اور آپ جانتے ہیں کہ علمِ الٰہی پیغمبرؐ پر نازل ہوا ہے، آنحضرتؐ نے یہ علم اولوالامر (ائمہؑ) کو عطا کر دیا ہے،

اور وہ حضرات دروازۂ علم و حکمت اپنے نمائندوں کے لئے کھول دیتے ہیں۔

۷۔ سورۂ نساء کی یہ دونوں نمائندہ آیتیں یعنی آیۂ اطاعت (۴/۵۹) اور آیۂ استنباط (۴/۸۳) صاحبانِ امر کے بارے میں ہونے کی وجہ سے ایک ہی مضمون کی ہیں، اور وہ ایک دوسرے کی تفسیر ہیں، ان میں اوّل الذکر کا ترجمہ یہ ہے: اے ایمان والو خدا کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور صاحبانِ امر کی جو (پوری تاریخ اور تمام ادوار میں) تمہارے ساتھ ہیں پس اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اس مسئلہ میں خدا اور رسولؐ (اور صاحبانِ امر) کی طرف رجوع کرو اگر تم خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو یہی (تمہارے حق میں) بہتر ہے اور تأویل کے لحاظ سے بہت اچھا ہے (۴/۵۹)۔

۸۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہمیشہ کے لئے یاد رہے کہ جس طرح خدا و رسولؐ کے بعد اُولی الامر (ائمہ) کی اطاعت فرض کی گئی ہے، اسی طرح مسائل میں ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے لیکن اس میں اطاعت مقدّم ہے، اور رجوع مؤخّر، اس لئے اگر کوئی شخص اللہ، پیغمبرؐ اور صاحبِ امرؑ کی کامل فرمانبرداری (اطاعت) کے بغیر علمی مسائل کے لئے رجوع کرے تو علم و حکمت کا دروازہ نہیں کھلے گا، کیونکہ اس کی اوّلین اور سب سے بڑی شرط اطاعت

ہے۔

۹۔ اگرچہ آیۂ اطاعت (۴/۵۹) میں بظاہر یہ حکم نظر نہیں آتا کہ تم نظریاتی تنازع کے فیصلہ کے لئے اولی الامر سے رجوع کرو، لیکن آیۂ اِستنباط میں رجوع کا حکم واضح ہے کہ وہ اس کی تفسیر ہے، نیز اطاعت بہت اعلیٰ شی ہے، اور رجوع اس کا تابع ہے، یعنی جب کوئی نیک بخت مومن خدا، رسولؐ اور امامؑ کی حقیقی اطاعت کر رہا ہو تو اسی کے ساتھ خود بخود رجوع بھی ہو جاتا ہے، اور کسی رسمی سوال کے بغیر ہر قسم کا جواب ملتا رہتا ہے، اور یہی ہدایتِ کاملہ ہے۔

۱۰۔ قرآنی الفاظ کی شان بڑی عجیب و غریب اور انتہائی نرالی ہے، مثلاً جس لفظ کا جیسا لغوی پس منظر ہے، اس میں ویسی ہی تاویل بھی رکھی گئی ہے، چنانچہ اِستنباط کے اصل معنی ہیں کنواں کھود کر پانی تک پہنچنا اور پانی نکالنا، جس کی تاویل ہے عالمِ شخصی میں کنواں کھود کر روحانی علم کا پانی نکالنا، اور یہ تأویل ایسی نہیں جس سے کوئی دانشمند انکار کر سکے، پس امامِ زمان صلوات اللہ علیہ کے خاص علمی نمائندوں کا کام اِستنباط کرنا ہے، جیسا کہ ہمارے ماضی کے بزرگوں نے کیا۔

۱۱۔ ہر مومن، ہر مسلمان اور ہر انسان کی زمینِ روحانی کی کم گہرائی میں آبِ شیرین کا کبھی ختم نہ ہونے والا بہت بڑا ذخیرہ

موجود ہے، پس جو لوگ آبِ علم کے اس امکانی کنوئیں کو استعمال نہیں کرتے ہیں، ان کے لئے افسوس ہے، کیونکہ انہوں نے عالمِ شخص کے معجزاتی کنوئیں کو بیکار اور عالیشان شاہی محل کو خالی چھوڑا ہے (بئرٍ مُعَطّلہ، قصرٍ مَشید ۲۲/۴۵)۔

۱۲۔ گائے یا بیل آدمی کے نفسِ خورندہ کی مثال ہے، چنانچہ ہر بالغ مومن ابتداءً قصۂ بنی اسرائیل کے اُس بیل کی طرح ہے، جس کو ذبح کرنے کا حکم ہُوا، جس سے شدید ریاضت اور فنا مراد ہے، اگر اس میں کامیابی ہوئی تو وہ سالک اس بیل جیسا رام (تابعِ فرمان) ہو جاتا ہے، جو ھل چلاتا ہے، اور اگر اس سے بھی زیادہ ترقی ہوئی تو وہ روحانی شخص قرآنی مثال میں ایسا بیل ہے، جو کنوئیں سے پانی نکال کر لوگوں کی کھیتی باڑی کو سیراب کر دیتا ہے (۲/۷۱) یعنی باطنی علم کے پانی سے عالمِ شخصی کے باغوں، گلزاروں، اور کھیتوں کو سیراب و معمور کرتا رہتا ہے۔

۱۳۔ چاہِ علم (علمی کنواں) کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے متعلق یہ ہے کہ انہوں نے اس عظیم المرتبت پتھر کو ہٹا دیا، جو کنوئیں کے دہانہ پر رکھا ہُوا تھا، جس سے گوہرِ عقل مراد ہے، کیونکہ اس مثال میں علم و حکمت کا کنواں اسی پتھر کے نیچے ہے (۲۸/۴۴)۔

۱۴۔ حضرت یوسف علیہ السّلام کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں کی اندھیری گہرائی میں ڈال دیا، مگر اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو نور بنا کر

چاہِ عقل (عقلی کنوئیں) میں رکھ دیا، تاکہ یہ نور اسی مقام سے طلوع ہو کر وہیں غروب ہو جائے، (۱۲/۱۵) اور یہیں سے ہر مومنِ سالک کو یوسفِ زمان مل جاتا ہے، یعنی امامِ زمان صلوات اللہ علیہ وسلامہٗ کا نورِ مقدس۔

۱۵۔ اس بیان سے جو شروع سے اب تک ہُوا ظاہر ہے کہ "اِستنباط" تاویل کا دوسرا نام ہے، اور یہ تاویل سے ہرگز کم نہیں، جیسا کہ ذکر ہوا کہ اس کا تعلق اُن حضرات سے ہے، جن کو ربّ العزّت نے بوسیلۂ امامِ عالیمقامؑ تاویل کرنے کی نورانی تائید و توفیق عنایت فرمائی ہے۔ اللّٰھُمَّ صَلِّ علٰی محمّدٍ وّ آلِ محمّد۔

نصیرُالدّین نصیر ہونزائی، لنڈن۔
۸ ذوالحجّہ ۱۴۱۱ھ
۲۱ جون ۱۹۹۱ء

تعلیمی سوالات

ا۔س : آپ ہمیں عالمِ شخصی ہی کے حوالے سے قرآنِ پاک کا یہ مطلب سمجھا دیں : شروع شروع میں سب لوگ ایک ہی جماعت تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا، جو کہ خوشی سُناتے تھے اور ڈراتے تھے، اور ان کے ساتھ کتاب نازل فرمائی... (۲/۲۱۳) آیا لوگ پہلے ہی سے موجود تھے؟ اور انبیاء علیہم السّلام بعد میں بھیجے گئے؟ کیا تمام پیغمبروں کی آسمانی کتاب ایک ہی ہے؟

ج : عالمِ شخصی میں سب سے پہلے بشکلِ خلیّات و ذرّات بے شمار لوگوں کی نمائندگی موجود ہوتی ہے، پھر اس کے بعد روحانی عروج و ارتقاء کے نتیجے میں انوارِ انبیاء کے مختلف ظہورات ہوتے ہیں، اور وہاں تمام ظاہری کتبِ سماوی کی ایک ہی روح و روحانیت ہوتی ہے، جس کا نام قرآنِ حکیم میں "الکتاب لا ریب

فیہ" ہے، یعنی وہ کتاب جس میں کوئی شک نہیں (۲/۱)۔

۲۔ س: آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ نور اپنے سلسلے میں ایک پاک پیشانی سے دوسری پاک پیشانی میں منتقل ہوتا رہتا ہے، مگر قرآن وحدیث میں نور کی منتقلی کے بارے میں ذرّیت اور اصلاب و ارحام کا ذکر فرمایا گیا ہے، آپ اس کی وضاحت کریں۔

ج: وجود و ہستی کے اعتبار سے نور کے تین مراتب ہیں: مرتبۂ جسمی، مرتبۂ روحی، اور مرتبۂ عقلی، چنانچہ نُور کا جسمانی فرزند پُشتِ پدر اور بطنِ مادر سے ہے، روحانی فرزند ذکر و عبادت سے ہے، جبکہ وہی طریقِ بندگی اپنائے، جو روحانی باپ نے بتایا ہے، اور عقلانی فرزند علم و حکمت سے پیدا ہوتا ہے، پس مرتبۂ عقل پر نور ایک پیشانی سے دوسری پیشانی میں منتقل ہو جاتا ہے۔

۳۔ س: سورۂ مُلک کے آغاز (۶۷/۱) میں یہ ارشاد ہے: خدا نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے تُو رحمان کی خلقت میں کوئی فرق نہ دیکھے گا۔ یہاں یہ پوچھنا ہے کہ آیا سارے آسمان نیچے سے اوپر تک درجہ بدرجہ نہیں ہیں؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ درجہ وار ہیں، تو پھر ہم کس طرح یہ سمجھ سکیں کہ رحمان کی مخلوقات میں کوئی فرق و تفاوت نہیں؟

ج: نورِ عقل عالمِ وحدت ہے، جس کا ہر ظہور ایسا باکمال اور علم و قدرت سے بھرپور ہے کہ اس میں تمام چیزوں کی نمائندگی ہو

جاتی ہے، چنانچہ اس کے سات ظہورات جو یکسان ہیں، سات عقلی آسمان کہلاتے ہیں۔

۴۔ س: رُؤیت یعنی دیدارِ الٰہی کے بارے میں آپ کا ذاتی عقیدہ یا نظریہ کیا ہے؟ جبکہ قرآنِ کریم کا واضح ارشاد ہے کہ: لا تدرکہ الابصار۔ اس کو آنکھیں نہیں پا سکتی ہیں (۶/۱۰۳)؟

ج: میں سمجھتا ہوں کہ رُؤیت نہ صرف مومن کی جسمانی موت کے بعد ملنے والی سب سے بڑی نعمت ہے، بلکہ دنیا کی زندگی میں بھی بشرطِ فنائے نفسانی اس کا تجربہ ضروری ہے، ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ دیدۂ دل خدا تک رسا نہیں ہو سکتی، مگر وہ خود چشمِ سر کو پا سکتا ہے (وھو یدرک الابصار (۶/۱۰۳) خوب غور کر کے دیکھ لیں کہ یہ بالواسطہ ادراکِ تجلّی ہے، یعنی اس کے نورِ اقدس کے توسّط سے دیدار ہوتا ہے، اور اس حقیقت کے ثبوت میں قرآن و حدیث کے بہت سے دلائل موجود ہیں۔

۵۔ س: "اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرتِ آدم علیہ السّلام کو اپنی رحمانی صورت پر پیدا کیا۔" آیا اس میں ظاہری شکل کا ذکر ہے یا چہرۂ جان کا؟

ج: آدم اور آدمیوں کی جسمانی صورت ایک جیسی ہے، لہٰذا جو چیز سب کو دی گئی ہے، اس میں آدمؑ پر احسان کیوں کر ہو

سکتا ہے، پس یہ صورتِ روحانی کی بات ہے کہ خدا نے اپنے خلیفہ کو مقامِ عقل پر چہرۂ رحمان قرار دیا، اور یہ نکتہ بھول نہ جائیں کہ امام وقت آدمِ زمان ہوتا ہے۔

۶۔س: کیا قرآن کی ہر آیت کی طرح حدیث کا بھی ایک ظاہر اور ایک باطن ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کی کوئی مثال پیش کریں۔

ج: حدیثِ شریف میں ہے کہ بخار ربِّ غفور کی طرف سے مومن کے لئے پاکیزگی کا ایک وسیلہ ہے۔ اس ارشادِ نبوی کے ظاہر میں اگرچہ مرضِ بخار کا ذکر ہے، لیکن باطن میں روحانی زلزلہ مراد ہے، جس کا تذکرہ قرآنِ پاک کے چار مقامات پر ہے (۲/۲۱۴، ۲۲/۱، ۳۳/۱۱، ۹۹/۱)۔

۷۔س: سورۂ یاسین (۳۶/۱۲) کے حوالے سے کہتے ہیں کہ کائنات و موجودات اور قرآنیات و اسلامیات کے تمام علمی و عرفانی خزائن امامِ مبینؑ کے نورِ اقدس میں مجموع و محدود ہیں، اگر یہ بات درست اور حقیقت ہے تو پھر ہمیں بہ آسانی اور بلا مشروط علم کیوں نہیں دیا جاتا؟

ج: یہ انتہائی عظیم کارنامہ یعنی خدا کے خزانوں تک رسا ہو جانا نہ تو آسان ہو سکتا ہے اور نہ ہی شرائط کے بغیر ممکن ہے، تاہم غیر ممکن ہرگز نہیں، آپ اس سوال کی مناسبت سے حضرتِ موسیٰؑ کا وہ قرآنی قصہ پڑھ لیں (۱۸: ۶۰-۸۲) جس میں راہِ علم

لَدُنّی کی بہت سی مشکلات، شرائطِ تابعداری اور صبر و تحمّل کا ذکر فرمایا گیا ہے، تاکہ ہوشمند مومنین اطاعت و فرمانبرداری ہی سے نور تک پہنچ سکیں۔

۸۔س: اس میں کیا رازِ حکمت پوشیدہ ہے کہ خداوندِ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰؑ کو ہدایت کی غرض سے لوگوں کے پاس بھیجا، اور جس بندۂ خاص کی ذات میں روحانی علم کا بہت بڑا خزانہ تھا، اس کو دو دریاؤں کے سنگم پر رکھا؟

ج: ہدایتِ عامّہ اور روحانی علم کے اعتبار سے امامِ برحقؑ کے دو مقام ہیں، مقامِ اوّل جو جسمانی ہے اس میں لوگوں کی ظاہری ہدایت کے لئے امام کا سامنے ہونا ضروری ہے، دوسرا مقام جو باطنی ہے اس میں علمِ لَدُنّی کی غرض سے صرف قربِ روحانی ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

۹۔س: آپ کا کہنا ہے کہ قرآنِ حکیم کی ہر مثال میں جو حکمت پنہاں ہے، وہ امامِ زمان علیہ السّلام سے متعلّق ہے، آپ بتائیں کہ ملکۂ سبا کے عظیم تخت (۲۷/۲۳) کی کیا حکمت ہے؟ اور امامِ مبینؑ سے اس کا کیا تعلّق ہے؟

ج: امامِ مُستودع حضرتِ سلیمان علیہ السّلام کے حُجّتانِ شب میں سے ایک ملکۂ بلقیس تھی، جس کی بادشاہی بطریقِ روحانی امامؑ نے لے لی، اور وہ مسلمان ہو گئی، یہاں تخت سے سلطنت

مراد ہے، اگرچہ اس کے اور بھی معنی ہیں۔

۱۰۔س : کیا یہ ممکن ہے کہ مومنین بہشت کے روحانی مشاہدات کے سلسلے میں تاریخ عالم اور واقعاتِ اُمم کی جیتی جاگتی صورت کو بھی دیکھ سکیں ؟ اگر یہ ممکن ہے تو اس کی کیا دلیل ہے ؟

ج : کیوں نہیں، جبکہ جنّت ایسی جگہ ہے جہاں ہر مطلوبہ شی مل سکتی ہے (۵۰/۳۵) اور وہاں وہ چیزیں ملیں گی جن کو جی چاہے گا (۴۳/۷۱) اور جتنی چیزیں ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے کے خزانے ہیں اور ہم اس کو ایک مُعَیَّن مقدار سے اتارتے رہتے ہیں (۱۵/۲۱)... سب چیزیں بولنے والی کتاب میں محفوظ و موجود ہیں (۶/۵۹)

۱۱۔س : کیا یہ درست ہے جو کہا جاتا ہے کہ جس طرح آخرت سے دُنیا وجود میں لائی جاتی ہے، اسی طرح دُنیا سے آخرت بنائی جاتی ہے ؟ اگر یہ بات صحیح ہے تو دلیل سے سمجھا دیں۔

ج : جی ہاں، امر واقعی یہی ہے، جس کی قرآنی مثال یہ ہے کہ خالقِ اکبر ضِدَّیْن کو ایک دوسرے سے پیدا کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے : اے اللہ... تُو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تُو ہی بے جان سے جاندار کو پیدا کرتا ہے اور تُو ہی جاندار سے بے جان نکالتا ہے (۳/۲۷)۔

۱۲۔س : دنیا کی شکل آسمانوں اور زمین کی حیثیت میں ظاہر

ہے، لیکن آخرت کی صورت معلوم نہیں، کیا آپ اس بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟

ج: اِن شاء اللّٰہ (اگر خدا نے چاہا تو) دُنیا و آخرت درخت اور پھل کی طرح ہیں، یعنی کائنات گویا شجر ہے، اور انسان اس کا ثمر، پس آدمی کے عالمِ شخصی میں آخرت بحدِّ قوّت پوشیدہ ہے، جیسے پھل کی گُٹھلی میں درخت بحدِّ قوّت موجود ہوا کرتا ہے، اور یہاں یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ دُنیا کثیف ہے، اور آخرت لطیف، جس کی مثال عالمِ خیال اور عالمِ خواب ہے، اور اگر ان دونوں کو علم و عبادت سے کامل ترقی دی جائے، تو خیال اور خواب کی تحلیل سے عالمِ روحانیّت بن جاتا ہے، اور ایسی ہی مکمل روحانیّت آخرت اور جنّت کی مثال ہوسکتی ہے، دعا ہے کہ پروردگارِ عالمین نورِ علم و حکمت سے قلوبِ مومنین کو منوّر کردے! آمین!

نصیرُالدّین نصیؔر ہونزائی، لنڈن۔

۱۲ ذوالحجّہ ۱۴۱۱ھ

۲۵ رجون ۱۹۹۱ء

دائرۂ لطیف و کثیف

۱۔ اگر کوئی آدمی یہ سوال کرے کہ: بتاؤ دن پہلے ہے یا رات؟ تو اس کو یہ جواب دینا غلط ہوگا کہ رات پہلے شروع ہوتی ہے، اور یہ کہنا بھی درست نہیں کہ دن کا آغاز پہلے ہوتا ہے، کیونکہ ان دونوں کی گردش اپنے دائرے پر کسی تقدیم و تاخیر کے بغیر ایک ساتھ جاری ہے، مثال کے طور پر جب کرۂ ارض وجود میں آیا تو معاً زمین پر روز و شب کا آغاز ہوا، جیسا کہ سورۂ فرقان (۲۵/۶۲) میں خِلْفَة کے عنوان کے تحت اس کا ذکر آیا ہے، یعنی خدا نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والے بنائے، اور اس میں بے شمار حکیمانہ اشارے ہیں۔

۲۔ قرآن کریم کا فرمانا ہے کہ ہر چیز کی گردش دائرہ نما ہے (۲۱/۳۳، ۳۶/۴۰) اور اس کلیّہ سے کوئی مخلوق باہر نہیں، آسمان، زمین، سورج، چاند، ستارے، ہوا، پانی، وغیرہ سب اپنی اپنی گردش کے دائرے

بنا بنا کر زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ تصوّرِ آفرینش دائرے کی طرح ہے، جس کا کہیں بھی کوئی سرا نہیں، یعنی اس کی نہ تو کوئی ابتداء ہے اور نہ ہی کوئی انتہا، کیونکہ کوئی ایسا زمانہ نہ تھا اور نہ کبھی ایسا وقت آئے گا، جس میں خداوند تعالیٰ تخلیق کا کام نہ کرے، بلکہ جس طرح وہ اپنی ذات و صفات میں قدیم ہے، اسی طرح ہمیشہ کائناتوں کو لپیٹتا اور پھیلاتا رہتا ہے۔

۳۔ دنیا کی کوئی مخلوق جسامت میں چھوٹی ہو سکتی ہے مگر حکمت کے اعتبار سے کمتر یا فضول نہیں ہو سکتی، مثلاً ریشم کے کیڑے کو دیکھیں، جو وقت آنے پر تبدیل ہو کر پروانہ بن جاتا ہے، پھر وہ انڈے سے ہو کر کیڑا بن جاتا ہے، اس میں اہلِ دانش کے لئے دائرۂ لطیف و کثیف کا اشارہ موجود ہے، کہ انسان کثیف سے لطیف ہو کر پرواز کرتا ہے، اور اس پر خدا کی کیسی بے پایاں برکت ہے کہ پھر عمل کی غرض سے جسمِ کثیف کا لباس پہنتا ہے، جیسے پروانہ ریشم کو پیدا نہیں کر سکتا ہے، لہٰذا وہ اس مقصد کے لئے کیڑا بن جاتا ہے، تاہم اس دائرے میں بڑی بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

۴۔ تصوّف اور قانونِ وحدتِ ارواح کے بھیدوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ انسان، جنّ، پری، فرشتہ، روحانی وغیرہ دراصل ایک ہی ذات کی مخلوق ہے، اور بہشتِ بریں کی حور و غلمان بھی اسی سے ہیں، کیونکہ سرچشمۂ عقل و جان ایک ہی ہے، جو عقول و نفوس

کی بازگشت ہے، اور تمام اعلیٰ سرابیل (لباسِ لطیف ۱۶/۸۱) کے مظاہر آدم و آدمی ہی کے لئے ہیں، تاکہ وہ ان عظیم اور گرانقدر نعمتوں پر خدا کا شکر کرے، جیسا کہ حق ہے۔

۵۔ اس قدرتِ خداوندی اور "روح در روح" کے قانون میں بڑی سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ کبھی کبھار کسی شخص میں کوئی دوسری روح کس طرح داخل ہو جاتی ہے؟ کوئی جنّ؟ پری؟ اعلیٰ روح؟ یا ادنیٰ روح؟ اگر یہ واقعہ سچ ہے تو پھر اصل، باقاعدہ اور عارفانہ روحانیت کے مراحل میں اس نوعیت کے کیسے کیسے عجائب و غرائب رونما ہوتے ہوں گے؟ اس سے بھی بڑھ کر عالمِ لطیف یعنی بہشت کی عظیم روحانی سلطنت میں کیسی کیسی عجیب و غریب نعمتوں کی فراوانی ہوگی؟ آیا بہشت کا ہر گھر عقل و جان کی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ نہیں (۲۹/۶۴)؟ کیا وہاں کا ہر شاہی محل ایک مقدّس زندہ و گویندہ ہستی کی صورت میں نہیں ہو سکتا؟ یقیناً ایسا ہی ہے مگر محض الفاظ سے عالمِ لطیف کی عکاسی ممکن نہیں۔

۶۔ عجب نہیں کہ کوئی طالبِ حقیقت کچھ وقت کے لئے علم ہی کے جنگل میں کھوئے پھرے، اور شاید ایمانداری سے میں اپنا تجربہ بیان کر رہا ہوں، چنانچہ سب سے اہم اور سب سے مشکل علم قصّۂ آدمؑ میں ہے، وہ بہت بڑا نازک معاملہ ہے، کیونکہ اگر آدم شناسی میں ہم سے کوئی غلطی ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا:۔

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج تا ثُریّا می رود دیوار کج

مطالعۂ قرآن اور ہر آیۂ شریفہ میں عمیق اور انتہاہ غور و فکر کی عادت بے حد ضروری ہے، قانونِ فطرت (پیدائش) کے اعتبار سے حضرتِ آدمؑ اور دوسرے حضراتِ انبیاءؑ کے درمیان آیا کوئی فرق و تفاوت ہو سکتا ہے؟ اس کے لئے اللہ کی سُنّتِ ازل سے متعلق آیاتِ کریمہ کی روشنی میں دیکھنا از بس مفید ہوگا، اور آیۂ فطرت (۳۰/۳۰) بھی ہمہ رس روشنی ڈالتی ہے، پس لا نفرّق بین احدٍ مّن رّسلہ (ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے ۲/۲۸۵) کی ربّانی تعلیم میں مزید سوچنا چاہیئے۔

۷۔ قرآنِ حکیم فرماتا ہے کہ روح عالمِ امر سے ہے (۱۷/۸۵) جو خدا کی رسّی کی طرح دنیا میں آئی ہے (۳/۱۰۳) جس کا بالائی سرا ازلی و ابدی طور پر اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور زیریں سرا بشری قالب میں، روحِ اعظم کی دوسری مثال خورشیدِ انور ہے، اس کا نور اور عکس زمین کی ہر چیز پر پڑ رہا ہے، اگر دنیا بھر کے لوگ سورج کو ایک ایک آئینہ دکھائیں تو ان کے یہاں بہت سے سورج ہوں گے، حالانکہ آسمان میں صرف ایک ہی سورج ہے، چنانچہ ہر فردِ بشر کی دو انائیں ہیں، انائے عُلوی جو عالمِ امر میں ہے، اور انائے سفلی جو عالمِ خلق میں ہے، پس حضرتِ آدمؑ اور دوسرے تمام اہلِ جنّت کے لئے ایک توانائے اعلیٰ کے اعتبار سے یہ حکم تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ

جنّت ہی میں رہیں گے (ھم فیھا خالدون ۲/۲۵) اور دوسرا انائے اسفل کے لحاظ سے یہ امر ہوا کہ اس بہشت سے سب کے سب نیچے جاؤ (اھبطوا منھا جمیعًا ۲/۳۸)

۸۔ مولوئ معنوی کا قول ہے: ما آمدہ نیستیم ایں سایۂ ماست (ہم بہشت سے نکل کر دُنیا میں آئے ہی نہیں ہیں، یہ ظاہری وجود ہماری اُس ہستی کا سایہ ہے) اگر یہ حقیقت ہے تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہمارا سایہ ازل سے دائرۂ لطیف و کثیف پر گردش کر رہا ہے، اور پروردگارِ عالم کی لاتعداد نعمتوں کے حصول کا طریقہ بس یہی ہے، کیونکہ دنیا ہی آخرت کی کھیتی باڑی ہے۔

۹۔ انسان، جنّ، پری، فرشتہ، دیو اور شیطان کے بارے میں جاننے کی غرض سے حضرتِ حکیم پیر ناصر خسرو قدس کی مشہور کتاب جامع الحکمتین (ص ۱۳۵۔۱۴۴) کا مطالعہ کریں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ انسان ہی ہے، چنانچہ آدم سے قبل آسٹرل باڈیز (ASTRAL BODIES) میں زمین پر انسان ہی بستے تھے، مگر جسمِ لطیف کی وجہ سے جنّات کہلاتے تھے، ملاحظہ ہو: کتاب دعائم الاسلام، الجزء الاوّل، ذکر الرّغائب فی الحجّ۔ قانونِ فطرت یہی ہے کہ لوگ سب کے سب پھر جنّات ہو جائیں گے، یعنی جسمِ لطیف میں منتقل ہوں گے، جس کا عمل اُڑن طشتریوں کے ظہور

کے ساتھ ساتھ شروع ہو چکا ہے، جنّات سے پری مرد اور پری عورتیں مراد ہیں، ان میں سے جو نیک ہیں، وہ فرشتے ہیں، اور جو بد ہیں، وہ دیو اور شیاطین کہلاتے ہیں، یعنی شیاطینِ جنّی۔

۱۰۔ انسان ہی ہیں جو کثیف سے لطیف ہو کر پوشیدہ ہونے کی وجہ سے جنّ، روحانی حسن و جمال کے سبب سے پری، اور بہشت میں جا کر بسنے کی بنا پر حور و غلمان کہلاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی کا نام ہر بار مرتبہ اور کام کے مطابق بدل جاتا ہے، اور یہ ربِّ کریم کی عنایتِ بے نہایت ہے کہ اسی طرح بنی آدم کو ہر درجہ حاصل ہے، اسی معنیٰ میں کہا گیا ہے کہ انسان عالمِ اکبر کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، اور اس میں بصورتِ لطیف وہ سب کچھ مجموع و یکجا ہے، جو دنیائے ظاہر کی وسعتوں میں منتشر ہے۔

۱۱۔ قرآنی حکمت کی تجلّیات عقل و دانش والوں کو بیہوش کر دیتی ہیں، چنانچہ اس مضمون کی مناسبت سے یہاں اہلِ جنّت کی کوئی مثال لازمی ہے، وہ یہ کہ بہشت میں ہر مومن مُطَہَّرٌ (پاک کیا گیا) ہوگا، اور یہ حکمت اس آیۂ کریمہ کے پس منظر میں پوشیدہ ہے: ولھم فیھا ازواجٌ مُّطَھَّرَۃٌ (اور ان کے واسطے ان بہشتوں میں بیبیاں ہوں گی صاف پاک کی ہوئی ۲/۲۵) مُطَھَّرَۃ اسمِ مفعول ہے، جس کا کوئی فاعل ہُوا کرتا ہے، اور یہاں فاعل خدا ہی ہے، اسی نے مذکورہ بیبیوں کو جسمِ لطیف عنایت

فرما کر ہر قسم کی جسمانی آلائش سے پاک کر دیا ہے، ان کی روحانی تطہیر خصوصی ذکر و عبادت سے اور عقلی پاکیزگی علم و حکمت سے ہوئی ہے اور ان کے شوہروں کے بھی کلّی طور پر یہی اوصاف ہیں، کیونکہ بہشت میں میاں بیوی پری مرد اور پری عورت کی طرح برابر کے حسین و جمیل اور ہر طرح سے پاک ہوں گے۔

۱۲۔ حورانِ بہشتی کے تذکرے کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہم امامِ برحقؑ کی دعا سے اس خاص علم و حکمت کو آپ کے سامنے لانے کے لئے کوشش کریں، جو متعلقہ آیاتِ کریمہ میں مخفی و مخزون ہے، جیسا کہ سورۂ واقعہ (۵۶) کا ارشاد ہے: ہم نے زنانِ بہشت کو بنایا جیسا کہ بنانے کا حق ہے (یعنی ان کی ابتدائی اور جسمانی تخلیق دنیا ہی میں ہوئی، تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ حور ایک افسانہ ہے) پھر ہم نے ان کو کنواریاں بنایا (یعنی دنیا کی زندگی کے بعد ان کو جسمِ لطیف عطا ہوا، جس میں اب وہ کنواریاں ہو گئیں، اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ مردوں کو بھی کوئی بدن ملتا ہے، ۵۶ : ۳۵-۳۶)۔

نصیرالدین نصیر ہونزائی، لنڈن
۱۵، ذوالحجہ ۱۴۱۱ھ-۲۸ر جون ۱۹۹۱ء

بہشت اور خزائنِ اسرار

۱۔ بہشت کی معرفت:

خداوندِ بزرگ و برتر کی طرف سے نور اور کتاب یعنی قرآن کا نزول اس لئے ہوا ہے (۵/۱۵) کہ اہلِ ایمان بوسیلۂ علم و عمل اس مرتبۂ اعلیٰ پر فائز ہو جائیں، جہاں چشمِ بصیرت روشن ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنی ذات ہی میں ہر گونہ معرفت حاصل کر سکیں، کیونکہ انسان کی اپنی شناخت میں تمام معرفتیں جمع اور یکجا ہیں، پھر بہشت کی معرفت عالمِ شخصی سے باہر کیونکر ہو سکتی ہے، بلکہ اسی میں یقیناً جنّت کا مشاہدہ اور حصولِ معرفت ممکن ہے، اگر بہشت کی معرفت کا کوئی امکان نہ ہوتا، تو سورۂ محمّد (۴۷) کی آیۂ ششم کا یہ مفہوم نہ ہوتا کہ دُخولِ جنّت کی ضروری شرط اس کی معرفت ہی ہے، کیونکہ جو شخص اس دنیا میں حقائق و معارف سے اندھا ہو تو وہ آخرت میں

بھی اندھا ہی رہتا ہے (۱۷/۲۲)۔

۲۔ خزائنِ بہشت :

قرآنِ حکیم میں جن ربّانی خزانوں کا ذکر آیا ہے، وہ سب کے سب جنّت میں موجود ہیں، یہ خزائن زندہ و گویندہ ہونے کے ساتھ ساتھ رحمت و علم سے بھی مملو ہیں، رحمت نفوس کے لئے ہے، اور علم عقول کے لئے، اور یہیں سے رحمت و علم کی ایک ایک صورت ہر چیز کو عطا کر دی جاتی ہے، جب کسی مملکت میں کوئی بڑی سے بڑی دولت پھیلی ہوئی ہوتی ہے، تو اس کو خزانہ نہیں کہتے، کیونکہ خزانہ اس محدود مقام کا نام ہے، جس میں بصورتِ زر و گوہر (اور دیگر قیمتی اشیاء) سارا سرمایہ سمیٹا ہوا ہوتا ہے، اسی طرح خزائنِ بہشت خزائنِ اسرارِ الٰہی ہیں۔

۳۔ ایک اہم سوال :

آیا کوئی شخص دُنیا ہی میں جنّت کا مشاہدہ کر سکتا ہے؟ اس حدیثِ قدسی کا کیا فیصلہ ہے: أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِين مالا عينٌ رأت ولا اذنٌ سمعت ولا خطر علیٰ قلبِ بشر (میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جسے نہ آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سُنا اور نہ کسی انسان

کے دل میں گزرا)؟

جواب: اس ارشاد کا اطلاق ہر قسم کے بشر پر ضرور ہوتا ہے، مگر فرشتگانِ ارضی وسماوی پر نہیں، چنانچہ حضرتِ آدمؑ کو فرشتۂ ارضی کی حیثیت سے بہشت کی معرفت حاصل تھی، اسی طرح ہر انسانِ کامل فرشتۂ ارضی ہوا کرتا ہے، اور ہر وہ مومنِ سالک بھی فرشتۂ ارضی ہے، جس کو فنا کا تجربہ حاصل ہوا ہو۔

۴۔ نفوسِ مطمئنّہ:

زمین پر کسی کے فرشتہ ہونے کی بہت بڑی شرط حقیقی اطمینان ہے (۱۷/۹۵) آپ اس مبارک لفظ کی حکمتوں کے لئے قرآنِ پاک کے تیرہ مقامات پر دیکھ لیں، خصوصاً سُورۂ فجر (۸۹/۰) کی آخری چار آیاتِ مقدّسہ کو غور سے پڑھ لیں، جن کا ترجمہ یہ ہے: اے اطمینان والی روح، تُو اپنے پروردگار کی طرف رجوع کر (واپس ہو جا) تو اُس سے خوش وہ تجھ سے راضی، پس میرے (خاص) بندوں میں داخل ہو جا، اور میری جنّت میں داخل ہو جا (۸۹: ۲۷-۳۰) یہ حکم ہر ایسے مومن کے لئے ہے جو فنا فی الامامؑ، فنا فی الرّسولؐ، اور فنا فی اللہ کے مرتبہ کو پاتا ہے، کیونکہ اطمینان جسمانی موت میں نہیں، نفسانی موت میں ہے، جو ذکر و عبادت کی کثرت، حقیقی علم، نیک اعمال، اور روحانیت کے عروج و ارتقاء سے واقع ہوتی ہے۔

۵۔ انسانِ کامل میں بہشت:

جب بندۂ مومن علیؑ زمانؑ میں فنا ہو جاتا ہے، جیسا کہ حق ہے، تو اسی وسیلہ سے وہ دوسرے ائمۂ طاہرینؑ اور رسولِ پاکؐ میں فنا ہو جاتا ہے، سو یہی ہُوا خدا کے خاص بندوں میں داخل ہو جانا (فادخلی فی عبادی ۸۹/۲۹) اور اسی میں فنافی اللہ کا سب سے بلند ترین مرتبہ پوشیدہ ہے، پس معلوم ہوا کہ مومنِ سالک سب سے اعلیٰ روحانیت کی بہشت میں داخل ہو جاتا ہے (۸۹/۳۰) اور نورِ خداوندی اس کے لئے حواسِ ظاہر و باطن کا کام کرتا ہے، تاکہ بندۂ مومن کو ہر قسم کی معرفت حاصل ہو، جیسا کہ اس حدیثِ قدسی میں ہے جو نوافل اور تقرّب کے بارے میں ہے۔

۶۔ بہشت میں تین قسم کی نعمتیں:

وجودِ انسانی تین چیزوں کا مجموعہ ہے: جسم، روح اور عقل، لیکن یہ چیزیں دنیا میں یعنی شروع شروع میں ناتمام ہیں، لہٰذا اہلِ جنّت کی حیاتِ طیّبہ (۱۶/۹۷) جسمِ لطیف، روحِ پاک اور عقلِ کامل میں ہوگی، اسی طرح میوہ ہائے بہشت لطیف جسمانی (جیسی خوشبوئیں) روحانی اور عقلی قسم کے ہوں گے، روحانی غذاؤں کی مثال ذکر و عبادت، حمد و ثنا، نعتِ رسولِ مقبولؐ اور امامِ

عالیمقامؑ کی منقبت ہے، اور عقلی نعمتیں علم و حکمت اور اسرارِ الٰہی میں ہیں، ان میں سے کوئی نعمت ختم ہونے والی نہیں، اور نہ اللہ کی نعمتوں کو انسان شمار کر سکتا ہے، جیسے قرآنِ پاک میں ہے: اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننے لگو تو نہ گن سکو (۱۶/۱۸)۔

۷۔ آنکھوں کی ٹھنڈک:

بہشت کے ہر درجے میں جو بے مثال اور لازوال نعمتیں دیدار، ملاقات، مشاہدہ اور نظارہ سے متعلق ہیں، وہ قرآن میں آنکھوں کی ٹھنڈک (... قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۳۲/۱۷) کہلاتی ہیں، ان میں تجلّیاتِ ربّانی سب سے خاص اور سب سے افضل ہیں، اور جنّت کی رحمتِ کُلّ سے بعید نہیں کہ نورِ ہر مومن اور مومنہ سے کہے کہ میں عالمِ شخصی میں تمہارا فرزند ہوں، کیونکہ قُرَّةُ الْعَيْن میں ہر قسم کی اولاد کا اشارہ بھی ہے، دوسری جانب یہ بات انسان کی عادت میں شامل ہے کہ وہ پُرانے رشتوں کو بھول جاتا ہے، پس اللہ تبارک و تعالیٰ نے عالمِ ذرّ میں سب لوگوں کو آدمِ زمانؑ کی پشتِ مبارک سے پیدا کیا، تاکہ بہشت والے اس نورانی رشتے میں منسلک ہو کر ایک دوسرے کو "قرّۃ العین" قرار دیں۔

۸۔ سب کے سب بادشاہ کیسے؟:

دُنیا کے کسی ملک میں جہاں بادشاہت کا نظام ہو وہاں ایک ہی بادشاہ ہُوا کرتا ہے، اور باقی تمام لوگ رعایا اور محکوم ہوتے ہیں، بنا بریں یہ ایک علمی سوال ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کے مومنین کس طرح سب کے سب بادشاہ بنائے گئے (۵/۲۰)؟ جواباً عرض ہے کہ اس آیۂ شریفہ کی حکمت کا تعلق عالمِ شخصی سے ہے، جس میں بوسیلۂ فنا (جیسا کہ ہونا چاہیئے) ہر مومن روحانی بادشاہ ہو سکتا ہے، یہ سلطنت خدائے احد وصمد نے آلِ ابراھیمؑ اور آلِ محمدؐ کو اس لئے عطا کر دی ہے (۴/۵۴) کہ لوگ اپنے وقت کے نورِ مجسّم میں فنا ہو کر آخرت کے لئے اس بادشاہی کو حاصل کریں، کیونکہ بہشت میں یہی حکمرانی ہے جو بڑی سلطنت (مُلکاً کبیراً ۷۶/۲۰) کہلاتی ہے، آپ اچھی طرح سے سوچ سکتے ہیں کہ دنیا کی بادشاہی کیا ہے، اور جنّت کی سلطنت کیسی ہوگی؟

۹۔ سلطنتِ سلیمانی:

قرآنِ حکیم کا کوئی قصّہ اسرار و رموز کی بے پایاں دولت کے بغیر نہیں، چنانچہ حضرتِ سلیمان علیہ السّلام کی بادشاہی روحانی سلطنت کی مثال ہے، جو دوستانِ خدا کے عالمِ شخصی میں ہوتی

ہے، اور یہی سلطنت بہشت میں جاکر عظیم اور لازوال بن جاتی ہے، خوب یاد رہے کہ بادشاہی بہت بڑی مثال ہے، لہٰذا بہشت کی عظیم سلطنت (۷۶/۲۰) میں بہت سے اسرار اور بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں، اور یہ بہت سے انقلابی تصوّرات کی متقاضی ہے، مثلاً اوّلین و آخرین میں سے مقرّبین اور ابرار عوالمِ بہشت کے بادشاہ ہوں گے، اور رعیّت بنانے کی غرض سے دوزخِ جہالت کے سارے لوگوں کو جنّت میں منتقل کر دیا جائیگا، بہشت کی رعیّت کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟ اور اس کے بادشاہوں کو کس نعمت کی کمی ہو سکتی ہے؟ اس پر خوب غور کریں۔

۱۰۔ خدا ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے:

سورۂ رحمان (۵۵/۲۹) میں ہے: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ۔ قرآنِ حکیم کی ہر حکمت چوٹی سے شروع ہو جاتی ہے اور زمین پر نازل ہونے کے باوجود عرش پر جا پہنچتی ہے، چنانچہ یہاں یوم سے دَور مراد ہے، اور سورۂ ھود (۱۱: ۱۰۶ - ۱۰۸) میں دِقّتِ نظر سے دیکھ لیں کہ سب سے بڑا دَور وہ ہے جو ایک ساتھ دوزخ، بہشت اور کائنات کی عمر پر محیط ہے، سو خداوند تعالیٰ جب کائنات کو لپیٹ لیتا ہے، تو اسی کے ساتھ دوزخ اور بہشت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ تو اللہ کا ایک ہی دن

ہوا، لہٰذا ہم اس بات کے قائل ہو سکتے ہیں کہ ایسے ادوارِ عظیم کی کوئی ابتدا و انتہا نہیں، کیونکہ خدا ہر ایسے بڑے دَور میں یہی کام کرتا ہے، تاکہ کائنات، دوزخ اور بہشت کا تجدّد ہو۔

۱۱۔ زمین و آسمان کی تبدیلی:

تجدّدِ کائنات کا مطلب یہ ہے کہ اس زمین کی بجائے دوسری زمین بنائی جائے گی اور اسی طرح آسمان بھی دوسرے ہوں گے (۱۴/۴۸) جس طرح نورِ مجسّم کی پاک و مبارک شخصیّت ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہے، تاکہ اہلِ بہشت کے لئے عطیۂ الٰھی غیر منقطع اور لازوال رہے (۱۱/۱۰۸) اسی طرح ارض و سما کے تجدّدِ اَمثال کا سلسلہ جاری ہے۔

۱۲۔ جسمِ مثالی:

جس طرح پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ یکے بعد دیگرے دو متضاد چیزوں کے آنے جانے سے ایسے دائرۂ آفرینش کا تصوّر ہوتا ہے، جس کی نہ تو کوئی ابتداء ہے اور نہ ہی کوئی انتہا، چنانچہ خداوندِ مہربان نے انسان کو کثیف و لطیف دو جسم عطا کر دئے (۵۶/۶۱) تاکہ ہر فرمانبردار بندہ دُنیا و آخرت

دونوں سے فائدہ اٹھائے، جسمِ لطیف کے کئی نام ہیں، جیسے جسمِ مثالی، جسمِ فلکی، کوکبی بدن، جُثّۂ ابداعیہ، پیرہنِ یوسفی، جنّ، پری، وغیرہ۔

نصیرُالدّین نصیؔر ہونزائی

لنڈن (LONDON)

۱۸، ذوالحجّہ ۱۴۱۱ھ / یکم جولائی ۱۹۹۱ء

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

رحمتِ عالمینؐ

۱۔ آنحضرتؐ تمام جہانوں کیلئے رحمت :

سورۂ انبیاء میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے بارے میں ارشاد فرمایا : وما آرسلنٰک الّا رحمۃً للّعٰلمین (۲۱/۱۰۷) اور (اے رسولؐ) ہم نے تو تم کو سارے جہانوں کے حق میں از سرتاپا رحمت بنا کر بھیجا۔ یعنی حبیبِ خداؐ کا نورِ اقدس ابتدا ہی سے عوالمِ شخصی کے لئے سرچشمۂ رحمت رہا ہے، جس کی نمائندگی انبیائے کرامؑ اور ائمۂ طاہرینؑ نے کی، پس عالمین سے عوالمِ شخصی مراد ہیں، جیسا کہ حضرتِ امام جعفر الصّادقؑ کا ارشاد ہے کہ "عالمین" سے انسان مراد ہیں۔

۲۔ رحمت اور علم :

اگرچہ یہ بات حقیقت ہے کہ رحمت کا تعلّق روح سے

ہے، اور علم کا تعلق عقل سے، تاہم یہ بھی جاننا ہے کہ رحمت علم کے بغیر نہیں، اور نہ علم رحمت سے الگ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عالمِ بالا میں عقلِ کُل اور نفسِ کُل جو علم و رحمت کے سرچشمے ہیں وہ ایک ساتھ کام کر رہے ہیں، پس حضور انورؐ عالمین کے لئے نہ صرف رحمت ہی ہیں، بلکہ ساتھ ہی ساتھ علم بھی ہیں، جیسا کہ رسولِ خداؐ نے ارشاد فرمایا: میں علم کا شہر ہوں اور (زمانے کا) علیؑ اس کا دروازہ ہے، اور یہ حدیث بھی ہے: میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ (یعنی امامِ وقت) اس کا دروازہ ہے۔

۳۔ سب لوگوں کیلئے پیغمبرؐ:

سُورۂ سبا (۳۴/۲۸) میں دیکھ لیں کہ سرورِ انبیاء علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ماضی، حال، اور مستقبل کے تمام لوگوں کے لئے پیغمبر تھے، اس قانونِ الٰہی کے مطابق دورِ نبوّت میں انبیاء اور دورِ امامت میں اُئمّہ آپؐ کے نمائندے قرار پاتے ہیں، تاکہ اسی طرح کوئی زمانہ علم و رحمت سے بے نصیب نہ رہے، اور قیامت کے دن لوگ یہ نہ کہیں کہ ان کے زمانے میں نہ کوئی پیغمبر تھا، اور نہ کوئی نمائندۂ پیغمبر، جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے: لِئَلاّ یکونَ لِلنّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بعدَ الرُّسُلِ (۴/۱۶۵) تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کی خدا پر کوئی حُجّت

باقی نہ رہ جائے۔ اس آیۂ کریمہ کا اعجاز یہ ہے کہ یہاں صرف رسولوں کا ذکر ہوا، کیونکہ موقع کی مناسبت سے انبیا و ائمہؑ کا لزوم خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے، جبکہ بڑی حکیمانہ جامعیت سے یہ فرمایا گیا ہے کہ کوئی زمانہ نورِ ہدایت سے خالی نہیں ہو سکتا۔

۴۔ سِراجِ مُنیر = چراغِ روشن :

اس میں اہلِ ایمان کو ذرّہ بھر شک نہیں کہ حضورِ پاکؐ کی مبارک شخصیت میں خداوندِ دو جہان کا نورِ اقدس جلوہ گر تھا، اور اس حقیقت پر قرآن و حدیث کی شہادتیں کثرت سے مل سکتی ہیں، من جملہ ایک نمائندہ آیۂ شریفہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، اور وہ آیتِ پُر نور آیۂ سراج ہے (۳۳/۴۶) جس کے ارشادِ مبارک کے بموجب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تمام زمانوں کے لئے چراغِ روشن ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرتِ اقدسؐ کے نور نے نہ صرف زمانۂ نبوّت ہی میں علم و ہدایت کی روشنی پھیلائی، بلکہ ماضی کے انبیائے کرام اور مستقبل کے ائمۂ ھُدا کے توسّط سے بھی لوگوں کی رہنمائی اور دستگیری کی، اور "رحمتِ عالمین" جیسے لقبِ مبارک کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ نور ہمیشہ دنیا میں موجود ہو۔

۵۔ چار اسمائے رسولؐ :

شاید آپ کو علم ہوگا کہ آنحضرتؐ کے بہت سے بابرکت نام ہیں، ہم ان میں سے چار اسماء کا یہاں ذکر کرتے ہیں، وہ مبارک نام یہ ہیں : اوّل، آخر، ظاہر، اور باطن، یہ نور کا وصف ہے، آنحضرتؐ کا اوّل ہونا یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے سب سے پہلے نورِ محمّدی کو پیدا کیا، پھر اس کو پیغمبروں کے سلسلے میں چلایا، ظاہر یہ کہ عرب میں خاتم الانبیا کی مرتبت پر آپؐ کا ظہورِ قدسی ہوگیا، باطن یہ کہ نورِ عقل مخفی ہوتا ہے، اور آخر کا مطلب یہ ہے کہ حضورِ اکرمؐ کا نور ائمۂ آخرین کے سلسلے میں منتقل ہوگیا، تاکہ نورِ ہدایت سے دنیا کسی وقت بھی خالی نہ ہو۔

۶۔ نورٌ علیٰ نور (۲۴/۳۵) :

ایک نور پر دوسرا نور، لیکن کس طرح ؟ جبکہ باپ نور ہے، مگر جانشین بیٹا ابھی نور نہیں ہوا ؟ جواب : یہ ابتدائی وقت کی بات نہیں، آخری وقت کا ذکر ہے، جس میں وارث بھی نور ہو چکا ہوتا ہے، تبھی نورِ اوّل نورِ دُوُم میں منتقل ہو جاتا ہے، چنانچہ رسول اللہؐ پہلے ہی سے اپنے نورِ اقدس کا عکس مولا علیؑ کے قلبِ مبارک پر ڈال رہے تھے، اس عمل میں سب سے بڑی طاقت اللہ

کی رضا ہوتی ہے، پھر پیغمبرؐ کی خوشنودی، دُعا، شفقت، تعلیم، توجّہ وغیرہ اور حضرتِ علیؑ حصولِ نور کے لئے ہر طرح سے مستعد اور آدابِ ضروری سے باخبر تھے، اس کے علاوہ ان کو پیغمبرِ اکرمؐ سے بے پناہ محبّت تھی، اور اسمِ اعظم تو انبیاء و ائمّہ علیہم السّلام کا سب سے بڑا راز ہے۔

۷۔ آیۂ تطہیر:

آیۂ تطہیر سورۂ احزاب (۳۳/۳۳) میں موجود ہے، جو اہلِ بیتِ اطہار علیہم السّلام کی شان میں نازل ہوئی ہے، جس میں ربّ جلیل کا یہ اعلان ہے کہ وہ ان حضرات کو ہر طرح سے پاک و پاکیزہ کرنا چاہتا ہے، اس میں تین قسم کی پاکیزگی مقصود ہے: جسمانی، روحانی، اور عقلانی، اور یہ دراصل معجزۂ اسمِ اعظم اور عملِ روحانیت و نورانیت ہی ہوتا ہے، جو خاندانِ رسولؐ کے نورانی گھر میں ہمیشہ جاری ہے، پس خداوندِ عالم نے عملِ تطہیر کے نتیجے میں اہلِ بیت علیہم السّلام کو نورِ عقل بنا دیا، تاکہ اس کے علم و حکمت کی تجلیوں سے عالمِ دین منوّر ہو جائے۔

۸۔ اہلِ ایمان کی تطہیر:

ظاہری طہارت و پاکیزگی پانی سے ہوتی ہے، اور باطنی تزکیہ

علم سے ہوتا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کے کئی مقامات پر ارشاد ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ اپنے وقت میں علم و حکمت سے مومنین کو پاکیزہ کرتے تھے، اس سے پتا چلا کہ آیۂ تطہیر میں خدا کی جانب سے اہلِ بیت کو نورانی علم ملنے کا ذکر ہے، کیونکہ اس میں انتہائی پاکیزگی کے معنی ہیں، یعنی جہالت و نادانی کے میل کے نام و نشان کو مٹانا ہے، یہ اس وقت ممکن ہے، جبکہ ان قدسیوں کی ذات میں نورِ عقل کی علمی تجلّیات کا عالم ہو، اور علم و حکمت کی ضَو فشانیوں کے سوا کوئی وقت نہ گزرے۔

۹۔ سلمانِ فارسی:

بموجبِ ارشادِ نبوی سلمان فارسی کو اہلِ بیتِ اطہارؑ کی نورانیت میں داخل و شامل ہونے کا شَرَف حاصل ہوا تھا، یہ ایک ایسی عملی حقیقت ہے کہ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں، چنانچہ سلمان کی پاکیزہ ہستی میں بھی آفتابِ نور طلوع ہو گیا، اور اس روشن مثال میں عالی ہمّت مومنین کے لئے زبردست خوشخبری ہے، کیونکہ یہ روحانی عروج وارتقاء صرف سلمان ہی کی ذات تک محدود نہیں، بلکہ یہ وہی لطفِ عمیم ہے، جو نورِ ہدایت میں محو و فنا ہو جانے سے ہر مومن کو حاصل ہو سکتا ہے، آیا خزائنِ الٰہی میں کوئی ایسی نعمت ہو سکتی ہے، جس سے بندہ محروم رہے (۱۵/۲۱)؟ آپ اس

حدیث قدسی کو بار بار پڑھیں، جو اطاعت سے متعلق ہے (یا بنی آدم اطعنی ....)۔

۱۰۔ قرآن و اسلام کی نعمتیں:

قرآن اور اسلام اپنی بے شمار نعمتوں کے ساتھ اصلاً ایک زندہ نور ہے، جو آنحضرتؐ کے عالمِ شخصی میں طلوع ہوا (۵/۱۵، ۴۲/۵۲)، دوسری طرف رفتہ رفتہ قرآن کی تحریری صورت مکمل ہوئی، بغیر اس کے کہ نور میں ذرّہ بھر کمی واقع ہو، جیسے نزولِ قرآن کی وجہ سے لوحِ محفوظ میں جو قرآنِ مجید ہے (۸۵/۲۱-۲۲) اس میں کوئی فرق نہیں آیا، پس رسول اللہؐ کی ذاتِ اقدس میں جو نور بصورتِ ذاتی کائنات صوفگن تھا، اس میں لاتعداد نورانی، عقلی، علمی، اور روحانی نعمتیں تھیں، چنانچہ اگر یہ نور کاملاً حضورِ اکرمؐ کے جانشین میں منتقل نہ ہوتا، تو آنحضرتؐ کے بعد دین کامل نہ رہتا، اور خدا کی باطنی نعمتیں ناتمام ہو جاتیں (۵/۳، ۳۱/۲۰) لہٰذا حضرتِ خاتم الانبیاؐ کا نورِ اقدس مولا علیؑ کی پاک شخصیت میں منتقل ہو گیا۔

۱۱۔ ایک حدیث شریف:

جناب رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: میںؐ اور علیؑ ایک نور تھے، اور وہ نور آدمؑ کو پیدا کرنے سے چودہ ہزار

سال پیشتر خدائے عزّوجلّ کی درگاہ میں طاعت اور تقدیس کرتا تھا، جب آدمؑ کو پیدا کیا، اس نور کو آدمؑ کے صُلب میں رکھا، اور برابر ایک صُلب سے دوسرے صُلب میں منتقل کرتا رہا، یہاں تک کہ اس کو عبدالمطلب کے صُلب میں قرار دیا، پھر اس نور کو دو حصّوں میں منقسم کیا، میرے حصّہ کو عبداللہ کی پشت میں قائم کیا، اور علیؑ کے حصّے کو ابوطالب کے صُلب میں، پس علیؑ مجھ سے ہے اور میں علی سے۔ (کوکبِ دُرّی، بابِ دوم، منقبت ۱)۔

۱۲۔ حدیثِ خاصفُ النّعل:

پیغمبرِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: اے لوگو! تم میں سے ایک شخص ہے کہ وہ تاویلِ قرآن پر جنگ کرے گا، جیسا کہ میں نے تنزیلِ قرآن پر جنگ کی ہے۔ ابوسعید خُدریؓ کہتے ہیں: ہم نے عرض کی، یارسول اللہؐ! وہ شخص کون ہے، فرمایا: وہ شخص جو میری جوتی درست کر رہا ہے، ابوسعیدؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت امیر کے پاس جاکر خوشخبری دی، وہ میری بات کی طرف متوجہ نہ ہوئے گویا کہ وہ پہلے ہی سُن چکے تھے۔ (کوکبِ دُرّی، بابِ دوم، منقبت ۶۷)۔

نصیرالدّین نصیرؔ ہونزائی
لنڈن (LONDON)
۲۰ ذوالحجہ ۱۴۱۱ھ۔ ۳ جولائی ۱۹۹۱ء

سورۂ قیامت کی چند حکمتیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ خداوندِ بزرگ و برتر جس طرح اس سورہ کے شروع میں روزِ قیامت کی قسم کھاتا ہے، اس سے یومِ آخرت کی بہت بڑی اہمیت اور زبردست عظمت ظاہر ہو جاتی ہے ① اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہاں "نفسِ لوّامہ" یعنی ایسے جی (جان = روح) کی بھی قسم کھائی ہے جو اصلاحِ ذات اور روحانی ترقی کی غرض سے خود کو بار بار ملامت کرتا رہتا ہے، اور یہ عمل یقیناً گریہ وزاری اور مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات کے دوران زیادہ مؤثر و مفید ہو سکتا ہے، چنانچہ اس آیۂ کریمہ کا حکیمانہ اشارہ یہ ہے کہ ہوشمند آدمی وہ ہے، جو اخلاقی، علمی، عملی اور روحانی ترقی کی خاطر ہمیشہ اپنے آپ کو ملامت کرے، تاکہ "خود ملامتی" کے اس پُر حکمت طریق سے نفس کی پاکیزگی ہو کر راہِ روحانیت میں پیش رفت ہو سکے،

اس قسم میں نفسِ لوّامہ (بہت ملامت کرنے والا جی) کو مرتبۂ روحانیت و ذاتی قیامت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، تاکہ اہلِ دانش "خود تنقیدی" کے زرّیں اصول پر عمل پیرا ہو کر مرتبۂ نفسِ مطمئنہ (۸۹/۲۷) کو حاصل کریں ②

جسمانی موت کے بعد جس کیفیت میں دوبارہ زندہ ہو جانا ہے، اس کے متعلق بہت سے لوگ تو بنیاد ہی سے منکر ہیں، مگر جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں، ان کو قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ بزبانِ حکمت مزید دعوت ہے کہ اُخروی زندگی کو علم الیقین اور عین الیقین سے دیکھ کر سمجھ لیا جائے ③ ہڈیوں کی تاویل: جس طرح جسمانی زندگی میں ٹھوس چیزیں ہڈیاں ہی ہیں، اسی طرح حیاتِ روحانی میں اصل اشیا ذرّاتِ لطیف ہیں، جن کے یک جا ہو کر بصورتِ انسان زندہ ہو جانے کے بھیدوں کا علم رسولِ خدا صلعم کے برحق جانشینؑ کے خزانے سے مل سکتا ہے۔ انگلیوں کی پوریوں کی تاویل: دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں میں ۴ پوریاں ہیں، جو چار حُجّتانِ مقرّب (یعنی ... نَیْن وَ ... رَیْن) کی دلیل ہیں، باقی انگلیوں کی پوریاں ۱۲ + ۱۲ = ۲۴ ہیں، جو دن رات کے حُجّتانِ جزائر کی مثال ہیں، پس مومنِ صادق کے ذاتی اِنبعاث میں یہ ۲۸ حجج عالمِ شخصی کے لئے کام کریں گے ④ یہاں انسان کی اس بنیادی بُرائی کا ذکر ہے، جس میں وہ ھادیٔ برحق

کی نافرمانی کرتا ہے ⑤

بہت سے لوگوں کے دل میں وقوعِ قیامت کے بارے میں سوال موجود ہوتا ہے ⑥ قرآنِ کریم اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ قیامِ قیامت اس وقت ہوگا، جب کہ روحانیت کی طوفانی روشنی سے کسی کی چشمِ باطن خیرہ ہو جائے گی، یعنی ذاتی روحانیت کی ابتدا میں جہاں دریائے نور متلاطم ہوتا ہے، اس سے بھی منزلِ قیامت کچھ آگے ہے، پس سوچنے کی ضرورت ہے کہ آیا ایسی قیامت انفرادی ہو سکتی ہے یا اجتماعی ⑦ ؟

چاند حُجّت کی مثال ہے، خُسوفِ قمر (چاند گرہن) حُجّت کی روشنی میں رکاوٹ پیدا ہونے کی دلیل ہے ⑧ پھر وہ حُجّت یا دَورِ قیامت کا ہر مومنِ سالک آفتابِ امامت میں واصل ہو جاتا ہے، اگرچہ دَورِ قیامت میں امام علیہ السّلام اور اہلِ بیت (خاندانِ نورانی = نورانی فیملی) کے سوا حدودِ جسمانی ظاہر نہیں ہیں، کیونکہ آفتابِ نور طلوع ہو چکا ہے، تاہم دن کے وقت بھی چاند اور ستارے اپنی جگہ موجود اور روشن ہوتے ہیں ⑨

قیامت انفرادی ہو یا اجتماعی، بہرحال اس میں بہت بڑی سختی ہوا کرتی ہے، اور یہ کلیدی نکتہ بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ ذاتی قیامت میں اجتماعی قیامت بھی پوشیدہ ہوتی ہے، لہٰذا اس وقت انسان زبانِ حال سے کہے گا کہ اس عذاب سے

بھاگنے کی جگہ کہاں ہے ⑩ وہاں بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں، اور نہ کہیں پناہ مل سکتی ہے ⑪ مگر پناہ کے لئے صرف ایک ہی ٹھکانا ہے، وہ تیرے پروردگار کا حضور ہی ہے، جس نے تیری عقل اور روح کی پرورش کے جملہ ذرائع مُہیا کر دیئے تھے، اگر تُو نے اُن وسائل سے فائدہ حاصل کیا ہوتا، تو آج تجھ کو پروردگارِ عالم کے حضور میں پناہ مل جاتی ⑫ اس دن ہر آدمی کے اعمال پر علمِ الٰہی کی روشنی پڑے گی ⑬ کچھ لوگ براہِ راست چشمِ بصیرت سے اور بعض بالواسطہ اپنے اپنے اعمال دیکھیں گے ⑭ اگرچہ وہ عذر خواہی کیوں نہ کریں ⑮

اس حکم میں آنحضرتؐ علعم سے وحی کے بارے میں عجلت نہ کرنے کے لئے فرمایا جاتا ہے، نیز اس میں کارِ بزرگ اور ذکرِ اسمِ اعظم کی بابت ایک خاص راز بھی ہے ⑯ وحی نازل کرنا اور اس کا مکمل طور پر پڑھنا خدا کے ذمّہ ہے، اور یہ امر بھی اسی کے ذمّہ ہے کہ وہ ایک دن اسمِ بزرگ کے منتشر اذکار کو جمع کر لائے، اور سب سے بڑے اسم کو وہ خود پڑھ پڑھ کر سُنائے، یعنی اسمِ اعظم کو "خود کار" یا بولتا ذکر یا ذکرِ ناطق بنائے ⑰ حضورِ اکرمؐ سے فرمایا گیا کہ آپؐ اس انتظار کے بعد وحی اس طرح پڑھیں، جس طرح زبانِ قدرت پڑھ کر سناتی ہے، نیز اس میں یہ لطیف اشارہ بھی ہے کہ جب اسمِ اکبر

آٹومیٹک (AUTOMATIC) ہو جاتا ہے، یعنی از خود ذکر ہونے لگتا ہے، تو اس حال میں صرف خاموشی سے ذکرِ نورانی کو سننا پڑتا ہے (۱۸)

پھر اللہ تعالیٰ اپنی اس ذمّہ داری کا تذکرہ فرماتا ہے کہ اس نے دنیا میں تنزیلِ قرآن کے بعد اس کے بیان (تاویل) کا بھی اہتمام کر دیا ہے، دوسری طرف یہ اشارہ بھی ہے کہ جب اسمِ اعظم کا ذکر "خود کار" ہو گیا اور روحانیت کا طوفان برپا ہُوا تو اس کی تاویلات بھی اپنے وقت پر آسکتی ہیں (۱۹) یہاں اس بات پر اعتراض ہے کہ لوگ دُنیا اور اس کی جلد ملنے والی مسرّت و شادمانی کو چاہتے ہیں (۲۰) اور آخرت کی ابدی نعمتوں کو نظر انداز کرتے ہیں (۲۱) قیامت کے دن بہت سے چہرے تر و تازہ ہوں گے (۲۲) کیونکہ وہ اپنے پروردگار کے دیدارِ پاک سے مشرف ہوں گے، اور یہاں یہ بات جاننا از بس ضروری ہے کہ اعلیٰ روحانیت آخرت میں شامل ہے، اور معرفت کا موقع دنیا ہی میں ہے، اس لئے حقیقت یہی ہے کہ دوستانِ خدا بوسیلۂ فنا چشمِ سرّ سے حضرتِ ربّ العزّت کو دیکھتے ہیں، یعنی عارفوں کے لئے دنیا ہی میں مشاہدہ (رُؤیت) اور معرفت بے حد ضروری ہے (۲۳) اس کے برعکس بہت سے چہرے اس روز اداس ہوں گے (۲۴) کیونکہ ان کو گمان گزرے گا کہ اب اُن

کے ساتھ کمر توڑ برتاؤ ہونے والا ہے (۲۵)
قرآن فرماتا ہے کہ ہرگز ایسا نہیں جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو، جب جان گلے کی ہڈیوں تک پہنچ جاتی ہے تو یہی طریقِ روحانیت میں معجزۂ عزرائیلی ہے (۲۶) اور پوچھا جاتا ہے کہ کوئی جھاڑ نے پھونکنے والا ہے، مراد یہ ہے کہ عزرائیل جھاڑتا ہے اور اسرافیل پھونکتا ہے تاکہ مومنِ سالک کو منزلِ فنا کے عجائب و غرائب کا تجربہ حاصل ہو (۲۷) اور وہ گمان کرتا ہے کہ یہ جدائی کا وقت ہے، یعنی وہ گمان کرتا ہے کہ یہ جسمانی موت ہے، حالانکہ یہ نفسانی موت کا معجزہ ہے (۲۸) اور ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ جاتی ہے، کیونکہ مسلسل قبضِ روح کے اس معجزے کا سب سے بڑا اثر پاؤں پر پڑتا ہے، جبکہ جان سب سے پہلے وہاں سے سر کی طرف بلند ہو جاتی ہے، اور ہر بار اوپر سے پاؤں تک کچھ دیر سے پہنچتی ہے (۲۹) اس روز تیرے رب کی طرف جانا ہوتا ہے، بمعنیٔ فنا فی اللہ (۳۰) چونکہ یہ عالمِ شخصی ہے اس لئے اس میں کُلّ کی نمائندگی ہوتی ہے، چنانچہ مفہوم ہے: تو اس نے نہ تو عین الیقین سے امورِ دین کی تصدیق کی تھی اور نہ ہی اس کو نماز و دعا کی روح حاصل ہوئی (۳۱) لیکن اس نے تکذیب کی تھی اور مُنہ موڑا تھا، یعنی وہ حقیقت اور قیامت سے انکار کرتا تھا (۳۲) پھر ناز و نخرہ کے ساتھ اپنے لوگوں کی طرف جاتا تھا، کیونکہ اسے گمان تھا کہ وہ بہت کچھ جانتا ہے (۳۳) تیری

کمبختی پر کمبختی آنے والی ہے ﴿۳۴﴾ پھر تیری کمبختی پر کمبختی آنے والی ہے ﴿۳۵﴾

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا، ایسا نہیں ہوگا، بلکہ حکمت اسی میں ہے کہ بالآخر واحدِ قہّار سب کو زبردستی سے ایک کر دے گا ﴿۳۶﴾ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نورِ ہدایت کا آفتاب نہ عالمِ آب و گل میں روشنی ڈالے اور نہ عالمِ جان و دل میں ضیا پاشی کرے، حالانکہ جسمانی و روحانی تخلیق و تکمیل اور عروج و ارتقا کا سلسلہ جاری ہے، تو کیا وہ شخص ابتدا میں ایک قطرۂ منی نہ تھا جو (عورت کے رحم میں) ٹپکایا گیا تھا ﴿۳۷﴾ پھر وہ خون کا لوتھڑا ہو گیا، پھر خدا نے اس کو کئی مراحل سے گزار کر انسان بنایا، پھر اسے روحِ ناطقہ اور عقل عطا کر کے درست کیا ﴿۳۸﴾ پھر اس کے دو جوڑے بنائے، یعنی مرد اور عورت، پس یہی مثال دین میں بھی ہے، جس میں سب سے پہلے روحانی ماں باپ کا ہونا لازمی ہے، تاکہ کوئی شخص جسمانی طور پر پیدا ہو جانے کے بعد روحانی طور پر بھی پیدا ہو جائے ﴿۳۹﴾ تو کیا وہ خدا جو ہر چیز پر قدرت کاملہ رکھتا ہے، اس بات پر قادر نہیں ہے کہ مُردوں کو زندہ کر دے، جاننا چاہئے کہ اللہ نہ صرف جسمانی مُردوں ہی کو زندہ کرتا ہے، بلکہ وہ نورِ علم سے مُردگانِ جہالت کو بھی زندہ کر سکتا ہے، پس سورۂ قیامت میں شروع سے لے

کر آخر تک اگرچہ ظاہراً اجتماعی قیامت کا تذکرہ ہے، لیکن باطناً انفرادی قیامت کا بیان ہے، جس میں بشکلِ ذرّات سب لوگ حاضر ہو جاتے ہیں ﴿۴۰﴾

عزیزانِ من! یہ امر بیحد ضروری ہے کہ آپ پہلے پہل اس سُورۂ مبارکہ (۷۵) کو ترجمۂ قرآن میں دیکھیں، تاکہ اوّل لفظی معنوں کا علم ہو، اور اس کے بعد تاویلی حکمت کو سمجھنے کے لئے سعی کی جائے، ورنہ فائدہ نہیں ہوگا۔

نصیرُالدّین نصیرؔ ہونزائی

۲۵ ذو الحجّہ ۱۴۱۱ھ - ۸ جولائی ۱۹۹۱ء

کراچی : ۲۳/۱۲/۸۲

لنڈن : ۸/۷/۹۱

Institute for Spiritual Wisdom Luminous Science
Knowledge for a united humanity

دیدارِ الٰہی

میں انتہائی عاجزی اور محتاجی کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ سے توفیق وہمت اور یاری کے لئے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے ولیء زمان آلِ رسولؐ کے نورِ ہدایت سے میری رہنمائی اور دستگیری فرمائے، کیونکہ اُس کی تائید و نصرت کے بغیر کوئی کام ہو نہیں سکتا، خصوصاً دیدارِ الٰہی جیسے سب سے مشکل موضوع پر قلم اٹھانا، اس ضعیف و ناتوان بندے کے لئے قیامتِ صُغریٰ سے گزرنے کی طرح ہے، بہرکیف میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کے دیدارِ اقدس کی انتہائی عظیم نعمت تمام ظاہری و باطنی نعمتوں پر بادشاہ ہے، لہٰذا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دین کی سب سے اعلیٰ اور سب سے بڑی نعمت یہی ہے، اور یہ دونوں جہان کی روحانی اور عقلی بلندی پر اپنی بے مثال

عظمت و جلالت کی شان میں موجود ہے۔

دلیل ۱ : خالقِ اکبر نے دو قسم کی مخلوق پیدا کی : دکھائی دینے والی، اور نہ دکھائی دینے والی، اور وہ خود سبحانہٗ و تعالیٰ ان کی صفت سے پاک و برتر ہے، یعنی یہ اس کی اپنی صفت نہیں کہ دکھائی دے، اور یہ بھی اس کی تعریف نہیں کہ نہ دکھائی دے، جبکہ یہ دونوں باتیں مخلوق کے لئے ہیں، جس کا ذکر ہوا، پس خدا کے لئے کوئی حدّ نہیں، جیسا کہ اس کا اپنا قول ہے : وہی سب سے اوّل اور سب سے آخر ہے، وہی سب سے ظاہر اور سب سے باطن ہے (۵۷/۳) یہ اس حقیقت کی دلیل ہے کہ وہ کسی ایک حدّ میں محدود نہیں، وہ فعّالٌ لِّمَا یُرِید ہے، یعنی جو چاہتا ہے کرتا ہے (۸۵/۱۶) اس لئے اس کی شانِ کریمی سے بعید نہیں کہ وہ اپنے بندگانِ خاص کو دولتِ دیدار سے نوازے۔

دلیل ۲ : خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے (۲۴/۳۵) اس حکم کا براہِ راست تعلق چشمِ باطن سے ہے، دیدۂ ظاہر سے نہیں، یعنی چشمِ سر سے نہیں، بلکہ چشمِ سر سے اس نور کا مشاہدہ ہو سکتا ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کا نور عالمِ عقل و جان کا سورج ہے، اور جو صاحبانِ بصیرت عالمِ روحانی کا مشاہدہ کرتے ہیں، وہ اس آفتابِ نور کو دیکھ سکتے ہیں۔

دلیل ۳ : یہ واقعہ عالمِ آخرت میں نہیں، بلکہ دنیا ہی میں

پیش آیا، جب کہ ربِّ کریم نے بنی آدم (انسانانِ کامل) کی پشتوں سے ان کی ذرّیت کو ہٹا کر ان کو اپنی انائے عُلوی کے سامنے حاضر کر دیا، اور پوچھا: آیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں، ہم سب گواہ بنتے ہیں (۷/۱۷۲) یہ ہر انسانِ کامل کے عالمِ شخصی میں دیدارِ خداوندی کا تذکرہ ہے، کیونکہ حضرتِ آدمؑ کے حقیقی بیٹوں نے ربّ اور اس کی رُبُوبیت کو دیکھا، تب اُنھوں نے کہا کہ ہم گواہ ہیں، ورنہ یہ بات نہ ہوتی۔

دلیل ۴: حضرتِ آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمانی صورت پر پیدا کیا، یہ درحقیقت روحانی صورت کی بات ہے، اور حدیثِ شریف میں ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی نورانی صورت میں انتہائی حسین و جمیل ہے، نیز یہ حدیثِ قدسی بھی مشہور ہے کہ وہ ایک پوشیدہ خزانہ تھا، پس اس نے اپنی شناخت کی خاطر خلق کو پیدا کیا، چنانچہ یہ سب اشارے دیدار ہی کی طرف کئے گئے ہیں، تاکہ معرفت کی لازوال اور غیر فانی دولت حاصل ہو۔

دلیل ۵: شریعت کا پھل طریقت ہے، طریقت کا میوہ حقیقت اور حقیقت کا ثمرہ معرفت ہے، اس کی منطق یہ بنتی ہے کہ منزلِ حقیقت میں دیدارِ پاک ہے، اور اسی کا نتیجہ معرفت ہے، کیونکہ معرفت پہچان کو کہتے ہیں، جو مشاہدہ کے سوا ممکن ہی نہیں۔

دلیل ۶: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا:

من رآنی فقد رأ اللّٰہ یہ جس نے مجھے دیکھا بیشک اس نے خدا کو دیکھا۔ یعنی مرتبۂ روحانیت پر جس نے محبوبِ خداؐ کا دیدار کیا، اس نے گویا خدا کا دیدار کیا، اس سے ظاہر ہوا کہ دیدارِ خداوندی نمائندگی میں بھی ہے، جس طرح دین کے دوسرے بہت سے امور کی تکمیل نمائندہ ہی سے ہوتی ہے۔

دلیل ۷ : قرآنِ کریم میں جہاں واضح طور پر فنا فی اللّٰہ کا ذکر آیا ہے، وہاں چہرۂ خدا کا تذکرہ بھی موجود ہے، کیونکہ تجلّی اور دیدار ہی سے کاملین جیتے جی فنا ہو جاتے ہیں، آپ سورۂ رحمان (۵۵ : ۲۶ - ۲۸) میں دیکھیں۔

دلیل ۸ : فنا فی اللّٰہ کی تشبیہ و تمثیل کئی طرح سے دی گئی ہے، اگر یہ بات درست ہے، تو ہم یہ بھی مانیں گے کہ تجلّیٔ حق سے حضرتِ موسیٰؑ پر جو کچھ گزرا، وہ فنا فی اللّٰہ کی مختلف مثالوں میں سے ایک مثال ہے، کیونکہ دیدارِ خداوندی کے جمال و جلال کے سامنے کسی کی بشرّیت ٹھہر ہی نہیں سکتی، اور فنا کی روشن دلیل یہی ہے۔

دلیل ۹ : مولانا ھابیلؑ کو دیدارِ پاک اور فنا فی اللّٰہ کی عظیم سعادت نصیب ہوئی تھی، جس میں ان کی بشریت کی تشبیہ گوسفند سے دی گئی ہے، اور دیدارِ الٰہی کو نارِ مقدس کہا گیا ہے، یقیناً دیدار آتشِ عشق ہے، اور قبل از دیدار جو عشق ہے، وہ

اسی دُور رس آتش کی بابرکت حرارت ہے۔

دلیل ۱۰ : حضرتِ اسماعیل ذبیح اللہؑ کو مرتبۂ فنا فی اللہ حاصل ہُوا تھا، ان کے نفسِ حیوانی کی مثال بہشت سے لایا ہُوا دنبہ سے دی گئی ہے، اور خدا کا دیدار اور عشق نفسِ حیوانی یا دنبہ کے لئے چھُری کی طرح کام کرتا تھا (۳۷/۱۰۷)۔

دلیل ۱۱ : عشق، دیدار، اور فنا کی مثال شہیدوں کی شہادت سے دی گئی ہے اور ایسے ہی شہید واقعی جسماً وَ رُوحاً زندہ ہوتے ہیں، اور انہیں اِس دنیا میں بھی نور حاصل ہوتا ہے (۵۷/۱۹)۔

دلیل ۱۲ : قرآنِ مجید میں انبیائے کرام علیہم السّلام کے جتنے معجزات مذکور ہیں، ان سب کا تجدّد امامِ مبینؑ میں ہوتا ہے، امامِ زمان صلوات اللہ علیہ وسلامہ روحانیت و نورانیت کا وہ زندہ و گوینده آفتاب ہے، جو عالمِ شخصی میں طلوع ہو جاتا ہے، اور اسی طرح یہ بھی ایک نمائندہ دیدار ہے، اور اس میں سب کچھ ہے۔

دلیل ۱۳ : اگر حضرتِ موسیٰؑ کو خدا کا دیدار نہ ہوا ہوتا، تو آپؑ اپنی قوم میں سے منتخب کر کے ستّر رجال کو دیدارِ الٰہی کے لئے کوہِ طور نہ لے جاتے (۷/۱۵۵) دراصل یہ انتخاب حدودِ جسمانی ہی کا تقرّر و تعیّن تھا، صاعقہ صورِ اسرافیل کی آواز ہے (۳۹/۶۸) جس کی وجہ سے وہ ذاتی قیامت کے منظر کو دیکھنے لگے (تنظرون) اور اسی سے جیتے جی ان کی نفسانی موت واقع ہوئی، پھر خدا نے

ان کا انبعاث کیا، تاکہ وہ عظیم روحانی نعمتوں کا شکر بجالائیں (۲/۵۶)، وہ طلبِ دیدار میں کامیاب ہو گئے، اسی لئے شکر واجب ہوا۔

دلیل نمبر ۱۴: قرآنِ حکیم کے تمام اسرار حجابات میں ہیں، خصوصاً وہ اسرار پردۂ اخفا میں ہیں، جو عارفین کی دنیوی زندگی کی روحانیت میں دیدارِ الٰہی حاصل ہونے سے متعلق ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ حجاب کے پیچھے سے کلام کرتا ہے (۴۲/۵۱) پھر قرآنی بھیدوں کے لئے الفاظ کے پردے کیوں نہ ہوں۔

دلیل نمبر ۱۵: سلسلۂ دیدار کا ایک کلیدی لفظ "تَجَلّیٰ" (۷/۱۴۳) ہے، جس کے معنی ہیں: ظاہر ہُوا، روشن ہُوا (۹۲/۲) یعنی ربّ العزّت ظہور فرما اور جلوہ فگن ہُوا، اب یہاں پوچھنا یہ ہے کہ اس ظہور کے لئے درخواست کس نے کی تھی؟ کوہِ طور نے یا حضرتِ موسیٰؑ نے؟ معلوم ہے کہ یہ تجلّی موسیٰ کلیم اللہؑ کے لئے تھی، پس انہوں نے ربّ کو دیکھا، مگر نہیں دیکھ سکا جیسا کہ دیکھنے کا حق ہے۔

دلیل نمبر ۱۶: بڑی عجیب و غریب بات تو یہ ہے کہ پروردگار کا ایک علمی دیدار بھی ہے، کیونکہ علم روحانی اور نورانی صورت میں خدا کا نور ہے، اور نور کی گوناگون تجلیات ہوا کرتی ہیں، جن سے علم کی بہشت معمور و پُرنور ہو جاتی ہے۔

دلیل نمبر ۱۷: آپ قرآنِ پاک کے ۱۸ مقامات پر "دَرَجات"

کے مضمون کو خوب غور سے پڑھیں، ظاہر ہے کہ علم و عمل کی وجہ سے لوگوں کے مختلف درجے ہیں، مثال کے طور پر اولیاء (۱۰/۶۲) کا تصوّر کریں، ان کی روحانیت کا کیا عالم ہوگا؟ یقیناً پروردگار نے اپنے دیدارِ پاک کے گنجِ مخفی سے ان کو نوازا ہوگا، اور وہ حضرات فنا فی اللہ ہو کر مطمئن ہو چکے ہوں گے، اسی لئے ارشاد ہے کہ: یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں (۱۰/۶۲) یہ بحث الگ ہے کہ اولیاء کون ہیں؟

دلیل ۱۸: صراطِ مستقیم اور خدا کی رسّی کا ایک ہی مطلب ہے، پس جو لوگ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں (۳/۱۰۱) وہ گویا خدا کو مضبوط پکڑتے ہیں (۳/۱۰۱) پھر وہ اسی معنیٰ میں راہِ راست کی منزلِ مقصود میں پہنچ جاتے ہیں، یعنی وہ خزینۂ دیدار میں داخل ہو جاتے ہیں، یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی لقا اور خوشنودی بہشتِ برین سے بہت بڑی ہے (۹/۷۲) آپ پڑھیں، سوچیں اور پوچھیں کہ یہ بات کیوں ایسی ہے؟ آیا اس سے یوں نہیں لگتا کہ آپ کو بہشت سے بھی اوپر جانے کے لئے دعوت آئی ہے؟

نصیر الدین نصیر ہونزائی۔ لنڈن۔
۲۸ ذوالحجہ ۱۴۱۱ھ/۱۱ جولائی ۱۹۹۱ء

قرآنِ حکیم = خزینۂ خزائن

۱- قرآنِ حکیم سرچشمۂ آفتابِ ہدایت ہے، نامۂ اسرارِ الٰہی، مرقومِ قلمِ قدرت، شفاخانۂ سماوی، چشمۂ ماءُ الحیات، رسنِ نورانی، بہشتِ علم وحکمت، بحرِ گوہرزا، معدنِ جواہر، کانِ سیم وزر، ذخیرۂ شہد وشکر، آسمانِ عقل وخرد، عکسِ لوحِ محفوظ، طورِ تجلّیات، معجزۂ درختِ طوبیٰ، شہرستانِ دین ودانش، برجِ انوارِ حقائق، منبعِ اسلام، آئینۂ دو جہان، ربّانی نعمتوں کا دسترخوان، اہلِ جہان کے لئے روحانی یونیورسٹی، دبستانِ انبیاء، مدرسۂ اولیاء، منزلِ جبرائیلؑ، دربارِ دُرّبارِ خدا ورسولؐ، دریائے دُرّفشان، مجموعۂ معجزاتِ محمدؐ، ہدایت نامۂ سماوی، نردبانِ بامِ عرش، نسخۂ لاہوت، منظرِ ملکوت، غُرفۂ جنّت، راحتِ روح، فروغِ جان، قرّۃُ العیون، رحیقِ مختوم، جامع الامثال، تربیۃُ الرّوح، اکسیرِ الٰہی، کنز العرش،

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

کتاب الکتب، اور خزینۂ خزائن ہے، اب ہم ان شاء اللہ ذیل میں قرآنِ حکیم کی اسی آخری مثال کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

۲۔ یہ قرآنِ پاک مرتبۂ روح و روحانیت اور نور و نورانیت میں امام ہے، اور وہ امامِ برحق اسی مقام پر قرآن ہے، اسی معنیٰ میں قرآن علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ قرآن کے ساتھ، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے، ترجمہ: سو میں قسم کھاتا ہوں ستارے کے گرنے کے مقامات کی، اگر تمہیں علم ہو تو یہ ایک بڑی قسم ہے کہ بیشک وہ باکرامت قرآن ہے، جو ایک پوشیدہ کتاب (یعنی نورِ امامؑ) میں درج ہے کہ اس کو بجز اُن کے جو پاک کئے گئے ہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا (۵۶: ۷۵-۷۹)۔

مواقعِ نجوم کی وضاحت: مواقعِ نجوم سے انسانانِ کامل مراد ہیں، کیونکہ ان کی ذاتی قیامت میں نفوس و عقول کے ستارے ان میں گر جاتے ہیں، اور یہ بڑی قسم ہے کہ اسی طرح اللہ اپنے نمائندوں یعنی انبیاء و ائمہ علیہم السلام کی قسم کھاتا ہے، اگر خدا تعالیٰ کی یہ قسم ظاہری چیزوں کی مثال تک محدود ہوتی، تو اصل حکمت کو جاننے کے لئے علم کی جو شرط ہے وہ نہ ہوتی (لو تعلمون ۵۶/۷۶) یہاں یہ نکتہ جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی قسم کسی خاص راز کی طرف توجہ دلانے کی غرض سے ہوتی ہے، اور اسی طرح بڑی قسم کسی عظیم راز کی نشاندہی کرتی ہے، پس قرآن جس بلندی پر کتاب

مکنون میں ہے، وہاں خزینۂ خزائن ہے، اور یہ سرّ الاسرار (بھیدوں کا بھید) ہے۔

۳۔ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے یہ کلیّہ عطا فرمایا: لِکُلِّ شَیۡءٍ بَابٌ = ہر چیز کا ایک دروازہ ہوا کرتا ہے۔ یہ حدیثِ شریف سورۂ انعام کے ایک ارشاد (۶ : ۴۴) کے مطابق ہے، اس کائناتی اور آفاقی قانون کے مطابق قرآنِ پاک کا بھی کوئی دروازہ ہوگا، یقیناً اس کا دروازہ ہے، اور وہ وہی مبارک ہستی ہے، جس کو آنحضرتؐ نے اپنے علم و حکمت کا باب (دروازہ) قرار دیا، مختصر یہ کہ پیغمبرِ اکرمؐ قرآنی علم کا شہر اور اس کی حکمت کا گھر ہیں، اور علیؑ اس کا دروازہ۔ اور یہ ہرگز ممکن نہیں کہ ہدایت کا یہ نظام کبھی ہو اور کبھی نہ ہو، پس ظاہر ہوا کہ وہی دروازہ اب بھی موجود ہے، جو زمانۂ نبوّت میں تھا۔

۴۔ کسی مادّی گھر کا دروازہ کبھی دربان نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی کبھی ظاہری خزانے کا گیٹ پاسبان یا خزانچی کہلاتا ہے، لیکن اس کے برعکس جہاں کسی خزانے کا زندہ اور عاقل دروازہ ہو، وہی خود خزانہ دار بھی ہو سکتا ہے، چنانچہ کسی شک کے بغیر حضرتِ علی علیہ السلام قرآنی علم و حکمت کا دروازہ اور خازن ہے، اور یہی مرتبہ ہر زمانے کے امامؑ کا ہوتا ہے۔

۵۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہر آیۂ قرآن کا ایک ظاہر اور

ایک باطن ہے، سو آیئے آج ہم آپ کو ایک بڑی خاص اور بہت ہی مفید بات بتاتے ہیں، وہ اس آیۂ مقدّسہ کی تاویلی حکمت ہے: قال اجعلنی علی خزائنِ الارض اِنّی حفیظٌ علیم (۱۲/۵۵) یوسفؑ نے کہا کہ مجھے (عالم شخصی کی) زمین کے خزانوں کا خزانہ دار مقرر کر دو کیونکہ میں امانتدار اور واقف کار ہوں۔ اس قصہ میں بادشاہ سے امامِ مستقر مراد ہے، جو حضرتِ اسماعیل ذبیح اللہ کی نسل کے امامانِ مستقر میں سے تھا، چنانچہ حضرتِ یوسف امامِ مستودع نے اسی سے یہ درخواست کی تھی۔ الغرض خزائنِ علم و حکمت امامؑ ہی کے سپرد ہوتے ہیں، اس کی پُر حکمت مثال قصۂ یوسفؑ میں ہے، کہ ذخیرۂ غلّہ کی تاویل خزانۂ علم ہے، جس کا خزانچی امامؑ ہوتا ہے۔

۶۔ ہر آدمی کے دل میں بحدِّ قوّت ایک انتہائی عظیم خزانہ پوشیدہ ہے، مگر اس کا دروازہ مُقفّل ہے (۴۷/۲۴) جس کی کلید اللہ رسولؐ، اور صاحبِ امرؑ کی اطاعت سے وابستہ ہوا کرتی ہے، جیسا کہ سورۂ زُمر (۳۹/۶۳) اور سورۂ شوریٰ (۴۲/۱۲) میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کی کوئی چیز قانونِ خزائن (۱۵/۲۱) سے باہر نہیں، یعنی ہر چیز کا ایک خزانہ، دروازہ، قفل اور کنجی ہوا کرتی ہے، چنانچہ جب اطاعت و محبّت کی کلید سے تالا کھول کر دروازۂ دل کو مفتوح کیا جائے، تو اِن شاء اللہ خازنِ قرآن کا نور ایسے

قلب میں طلوع ہو جائے گا، پھر قرآنِ کریم کے روحانی اور عقلانی معجزات کا تجدّد ہو گا۔

۷۔ سورۂ کھف (۱۸/۶۴، ۱۸/۸۲) میں دیکھیں: اتنے میں ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرا ہی چاہتی تھی تو اس بزرگ نے اس کو سیدھا کر دیا... یہ دیوار دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں ہیں اور اس دیوار کے نیچے ان کا ایک خزانہ ہے، اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ جاننا چاہیئے کہ "یتیم" امامِ عالیمقام" کے ناموں میں سے ہے، کیونکہ یتیم: فرد یعنی منفرد کو کہتے ہیں، اور یہ صفت حضرتِ امام علیہ السّلام کی ہے، کہ وہ یگانۂ روزگار ہے، پس دو یتیم لڑکوں کی تاویل یہ ہے کہ عالمِ شخصی کے ابتدائی مراحل میں جب کہ معجزۂ عزرائیل سے فنائے اوّل واقع ہوتی ہے اس وقت امامِ اقدس و اطہر کا نور اپنی لاتعداد شعاعوں سے طرح طرح کی مثالوں میں کام کرتا رہتا ہے، ان میں دو نورانی بچّوں کی گفتگو نمایاں ہے، جو امامِ مستقر اور امامِ مستودع کی مثال ہیں، اس دَوران بوجہِ فنا دیوارِ شخصیّت کے نیچے سے گنجِ اسرارِ روحانیت ظاہر ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، لہٰذا قبضِ روح کا مظاہرہ (DEMONSTRATION) بند کر دیا جاتا ہے، تاکہ فنائے دوم تک مومنِ سالک علم و عمل میں بالغ ہو جائے اور اپنے گنجِ گرانمایہ کو حاصل کرے، اور فنائے دوم مرتبۂ عقل پر ہے۔

۸۔ سورۂ ماعون (۱۰۷) کو خوب غور سے پڑھ لیں، شروع کی دو پاک آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: کیا تم نے اُس شخص کو دیکھا ہے جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے، سو یہ وہی شخص ہے جو یتیم کو دھکّے دیتا ہے، اور مسکین کے طعام کی ترغیب نہیں دیتا (۱۰۷/۱-۳) جیسا کہ اوپر ذکر ہوا یتیم امام علیہ السّلام کا نام ہے، اس کو خداوند تعالیٰ اور رسول صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اس لئے مقرّر فرمایا ہے کہ وہ اپنے نورِ پاک کے توسّط سے عالمِ شخصی میں آکر لوگوں کو علم دیا کرے، لیکن جو شخص امامِ عالیمقام سے دشمنی کرتا ہے، وہ گویا ایسے امامؑ کو جو خزائنِ علم وحکمت کے ساتھ گھر آیا ہو دھکّے دے کر نکال دیتا ہے، اس صورت میں علمِ قیامت کے نہ ہونے کی وجہ سے یومِ جزا کی تکذیب ہو جاتی ہے، اور ایسا شخص حجّت کے علم کی بھی ترغیب نہیں دیتا ہے کہ مسکین حجّت ہے، جس کے علم سے تسکین ملتی ہے، اس سے یہ حقیقت روشن ہوئی کہ حضرتِ امامؑ کا نور عالمِ شخصی یا عالمِ دل میں طلوع ہو جاتا ہے۔

۹۔ ہمیں اس بات کو تا بدرجۂ یقین جاننا ضروری ہے کہ نور کو نار کیوں کہا گیا (۲۷/۸) حالانکہ یہ نور ہے؟ اِس آگ یا نور میں کون ہے؟ اور اسکے گِرداگِرد کون ہیں؟ آیا یہ عقیدہ درست ہے کہ نور نہ صرف آفتابِ علم و ہدایت ہی کا نام ہے،

بلکہ وہ آتشِ عشق و محبت بھی ہے؟ کیا اسی آگ میں جلنا فنائے مطلق کا درجہ ہو سکتا ہے؟ یقیناً یہاں اسی عمل کی برکتوں کا ذکر ہے (۲۷/۸۰)۔

۱۰۔ بخدا ہم سب کو اللہ، رسولؐ، اور قرآن سے عشق ہے مگر یہ عقیدے کی حد تک محدود ہے، کیونکہ ہنوز ہم نورِ قرآن (۵/۱۵) کی آتشِ عشق میں نہیں جل رہے ہیں، حالانکہ خداوند تعالیٰ نے اس مقصد کے پیشِ نظر نور کو نار کہا ہے، ہم میں آتشِ عشق لگ جانے کی کوئی علامت نظر نہیں آتی، نہ کوئی درد، نہ رُوئے زرد، نہ کوئی بیقراری، نہ شب بیداری، نہ آنسوؤں کی برسات، نہ وقتِ سحر کی مناجات، اور نہ کثرتِ ذکر کا کوئی سلسلہ، اگر ہم حقیقی معنوں میں عبادت و اطاعت کرتے تو دل کا تالا خود بخود کُھل جاتا، اور ہم بذاتِ خود قرآن کی زندہ نورانیت میں داخل ہو جاتے، اور خزینۂ خزائنِ قرآن سے ہمیشہ جواہرِ اسرار کو حاصل کرتے رہتے۔

۱۱۔ قرآنِ کریم جہاں کتابِ مکنون میں ہے، وہاں اس کو چھُو لینا غیر ممکن تو ہرگز نہیں، لیکن اس کی شرط روحانی اور عقلی پاکیزگی ہے، اس کی بہترین مثال زمانۂ نبوّت سے مل سکتی ہے کہ حضورِ اکرمؐ حقیقی مومنین کو علمِ سماوی کا پانی اور حکمتِ بہشتی کا صابون عطا کر کے پاک کر دیتے تھے (۲/۱۵۱، ۶۲/۲) اور رسول اللہؐ کے بعد

بھی عملِ پاکیزگی کا یہی سلسلہ ائمۂ طاہرینؑ کے توسّط سے جاری ہے (۲/۱۵۰) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، کہ اس کی وہ ساری دینی نعمتیں جو زمانۂ نبوّت میں درجۂ تمامیت و کمالیت پر پہنچ چکی تھیں، وہ سب کی سب بلاکم و کاست آئندہ مومنین کے لئے بھی جاری و باقی رہیں گی۔

۱۲۔ قرآنِ پاک علم و حکمت کے خزانوں کا خزانہ ہے، اس کا وجودِ باطن حضرتِ رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تھے، یعنی قرآن کی روح و روحانیت نورِ نبوّت میں تھی، پھر وہ نور بحکمِ "نورٌ علیٰ نور" سلسلۂ نورِ امامت میں منتقل ہوگیا، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے نور کو عالمِ دل کا آفتاب بنادیا ہے۔

نصیرُالدّین نصیرؔ ہونزائی۔
لنڈن۔
۲ محرم الحرام ۱۴۱۲ھ
۱۴ جولائی ۱۹۹۱ء

سورۂ عصر کی چند حکمتیں

ISV Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

بِسمِ اللہ الرّحمٰن الرّحیم ۔ ترجمہ : عصر کی قسم، بیشک انسان گھاٹے میں ہے ، مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھّے کام کرتے رہے اور آپس میں حق (حقیقی علم) کی باتیں اور صبر کی کی وصیّت کرتے رہے (۱۰۳/۱-۳)۔

حکمت ۱ : عصر کے ایک معنی ہیں : نمازِ دیگر، نمازِ وُسطیٰ (۲/۲۳۸) اس سے اساس مراد ہے، یعنی حضرتِ علیؑ مرتضیٰ علیہ السّلام، ملاحظہ ہو: کتاب وجہِ دین : گفتار یا کلام ۲۰۔

حکمت ۲ : عصر کے دوسرے معنی ہیں : زمانہ، جس سے زمانۂ باطن مراد ہے، کیونکہ لفظِ "عصر" میں نچوڑنے اور نچوڑ (ست عطر، لُبّ لُباب، جوہر، خلاصہ، حاصل، نتیجہ) جیسے معنی ہیں، اور اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ ہر دَور کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں،

ایک کا تعلق ظاہر سے اور دوسرے کا لگاؤ باطن سے ہوتا ہے، مثال کے طور پر کسی قوم کی ظاہری تاریخ اتنی منظم اور کامل کبھی ہو ہی نہیں سکتی، جتنا کہ اس کا نامۂ اعمال نظم و ضبط کے ساتھ مکمل ہوتا ہے، اس مثال سے معلوم ہوا کہ زمانے کے روحانی پہلو کی بہت بڑی اہمیت ہے، جس کا تعلق صاحبِ تاویل سے ہے، یعنی صاحبِ عصر اساس ہے، اور اُمتوں کے اعمال ناموں سے زمانۂ باطن کا ثبوت ملتا ہے (۴۵/۲۸)۔

حکمت ۳: آپ یقین کریں گے کہ پروردگارِ عالم کی ہر بات اپنے معنی میں کائنات و موجودات پر حاوی اور محیط ہو جاتی ہے، چنانچہ رحمتِ خداوندی اور قرآنی حکمت اس بات کی مقتضی ہے کہ یہاں اس دولتِ پائندہ کا بھی تذکرہ یا اشارہ ہو، جس کے حاصل نہ ہونے کی وجہ سے کوئی انسان خسارے میں ہوتا ہو، جی ہاں، اس کا اشارہ لفظِ "عصر" ہی میں ہے، جس کی کلیدی حکمت شروع ہی میں بتائی گئی، مزید برآں سلسلۂ سخن جاری ہے کہ ید اللہ (خدا کا ہاتھ) کائنات و موجودات کو عالمِ شخصی کی طرف بچوڑتا اور لپیٹتا ہے تاکہ عالمِ صغیر میں ایک بہشت اور اس میں بڑی سلطنت قائم ہو جائے، پس کسی آدمی کا سب سے بڑا گھاٹا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی غفلت و جہالت کی وجہ سے ایسی عظیم سلطنت سے

ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

حکمت ۴ : سورۂ یوسف (۱۲: ۴۷-۴۹) کی مثال پیشِ نظر ہو: چنانچہ عالمِ دین میں ناطقوں کے سات بڑے ادوار ہیں، اور اماموں کے سات چھوٹے ادوار، پھر اس کے بعد دورِ قائم ہے، جس میں علمِ روحانی کی خوب بارش ہوگی، اس میں لوگ پھلوں کو نچوڑیں گے (یعصرون ۱۲/۴۹) یعنی تنزیل کی تاویل کریں گے، کیونکہ قرآنی پیش گوئی کے مطابق وہ تاویل کا زمانہ ہوگا (۷/۵۳) پس یہ "عصر" یعنی نچوڑنے کی تشریح ہے۔

حکمت ۵ : قانونِ فطرت ہمیشہ چیزوں کو نچوڑتا رہتا ہے، دیکھئے معدنیات زمین اور پہاڑ کے نچوڑ سے بنتی ہیں، نباتات جمادات کے نچوڑنے سے، حیوانات نباتات کا نچوڑ ہیں، انسان حیوانوں کا نچوڑ، اور انسانِ کامل عالمِ انسانیت کا خلاصہ (نچوڑ) ہے یہ "عصر" یعنی نچوڑنے کی ظاہری مثال ہے، جس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔

حکمت ۶ : اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی بہت بڑی قدرت اور عظیم حکمت ہے کہ وہ جلّ شانہٗ آسمانوں اور زمین کو نچوڑ کر اور لپیٹ کر عالمِ شخصی بناتا ہے، اور اس میں سب کچھ موجود ہوتا ہے، کیونکہ خداوندِ دو جہان ایسے میں اپنے تمام خزائن (۱۵/۲۱) کو بھی بے حد فیاضی سے اس میں رکھ دیتا ہے، چنانچہ اس کے خزانوں

سے کوئی شی باہر نہیں ہو سکتی ہے، آپ قرآنِ حکیم میں بار بار قانونِ خزائن اور قانونِ کُلّ کو بغور پڑھیں۔

حکمت ۷ : ید اللہ (دستِ خدا) یقیناً کائنات و مخلوقات کو ہر وقت نچوڑ اور لپیٹ لیتا ہے، درحالیکہ عالمِ جسمانی اور عالمِ روحانی اپنی اپنی جگہ موجود ہیں، اس کا راز یہ ہے کہ خداوندِ جہان تمام چیزوں کی باطنی صورت کو عالمِ شخصی کے مرتبۂ روح پر اور پھر مرتبۂ عقل پر گھیر لیتا ہے۔

حکمت ۸: مگر جو لوگ ایمان لائے جیسا کہ اللہ چاہتا ہے، یعنی خدا و رسولؐ اور نورِ مُنَزَّل (۶۴/۸) پر ایمان لائے، اچھے کام کرتے رہے، آپس میں حق و حقیقت کی باتیں اور صبر کی وصیت کرتے رہے، تو وہ بہت بڑے فائدے میں ہیں، اور وہ عظیم فائدہ یہ ہے کہ ان کو بہشت کی بہت بڑی سلطنت (۷۶/۲۰) ملے گی۔

حکمت ۹ : اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہمیشہ سے بمقتضائے حکمت خیر و شرّ دونوں کو پیدا کیا ہے، خیر کا وسیلہ ھادئ برحق ہے اور شرّ کا ذریعہ مُضِل یعنی شیطان، مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ مُضِل کے پاس بہت بڑا لشکر ہو، اور ھادی کے پاس قلیل فوج بھی نہ ہو، بلکہ ہمیں یوں سمجھ لینا چاہیئے کہ خیر و شرّ کی اس جنگ میں دونوں طرف برابر برابر ضروری سامان دیئے گئے ہیں، چنانچہ اگر مُضِل (شیطان) کے لئے یہ کام بہت آسان ہے کہ وہ آدمیوں

کے دلوں میں نہ صرف وسوسہ ہی ڈال سکتا ہے (۱۱۴/۵) بلکہ وہ ان سے مکمل طور پر گفتگو بھی کر سکتا ہے (۱۷/۶۴ ، ۵۹/۱۶) تو پھر یہ امر کیونکر ناممکن ہو کہ ھادیٔ زمان اپنے نورِ پاک سے مومنین کے باطن میں جلوہ فگن ہو جائے (۶/۱۲۲) اور انہیں علم و ہدایت کی دولت سے نوازے۔

حکمت ۱۰: حقیقی مومنین جس طرح آپس میں حق کی باتیں اور صبر کی وصیّت کرتے رہتے ہیں، اس سے برابری اور وحدت کا تصوّر ملتا ہے، اور یہ اس مجموعی صورت کا تذکرہ ہے، جس میں اہلِ ایمان بشر بھی ہیں، لشکرِ ارواح (ذرّاتِ روحانی) بھی ہیں، اور فرشتے بھی، یعنی اہلِ ایمان زمین پر آدمی ہیں، عالمِ ذرّ میں آسمانی لشکر، اور عالمِ عقل میں ملائک ہیں۔

حکمت ۱۱: جن لوگوں نے (قول و فعل اور علم و معرفت کے ساتھ) کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے پھر انھوں نے "استقامہ" کیا (یعنی اختیاری قیامت طلب کی) تو ان پر فرشتے اترتے ہیں ... ہم تمہارے دوست ہیں دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی (۴۱/۳۰-۳۱) ظاہر ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں مومنین ایک دوسرے کے دوست ہوا کرتے ہیں، پس وہ دوست فرشتے مومنین میں سے ہیں۔

حکمت ۱۲: اِس پُرحکمت سورہ میں آٹھ عنوانات ہیں:

عصر، انسان، خسارہ، ایمان، عملِ صالح، وصیّت، حق اور صبر، پس عصر میں بڑے مقدّس معنی پوشیدہ ہیں، اسی لئے خدا اس کی قسم کھاتا ہے، اگر انسان روحانی سلطنت کو حاصل نہیں کر سکتا ہے، تو وہ بہت بڑے خسارے میں ہے، یہاں جس ایمان کا ذکر ہے وہ درجۂ کمال کا ایمان ہے، اور اسی طرح نیک عمل بھی، یہ وصیّت حق الیقین سے متعلق ہے، اور صبر ذاتی قیامت کی سختیوں کے بارے میں ہے۔ اللّٰھمّ صَلِّ علٰی محمّد وّ آلِ محمّد۔

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی۔ لنڈن۔
۶ محرم الحرام ۱۴۱۲ھ ۱۸ جولائی ۱۹۹۱ء

لفظِ "تاؤیل" کی تحلیل

۱۔ قرآنِ کریم میں لفظِ "تاؤیل" سترہ دفعہ مذکور ہے، ہر اُس آیۂ مقدّسہ سے، جس میں تاویل کا ذکر فرمایا گیا ہے، تصوّرِ تاؤیل پر حکیمانہ روشنی پڑتی ہے، تاہم اصولِ تاویل کی بنیادی حقیقتیں سُورۂ یوسف سے معلوم ہو سکتی ہیں، کیونکہ خداوندِ تعالیٰ نے وہاں تاویل کو ایک جیتی جاگتی حقیقت کی صورت میں پیش کیا ہے۔

۲۔ التّأویلُ اوّل سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں: اصل کی طرف رجوع ہونا، کسی مثال کو ممثول (حقیقت) کی طرف لوٹانا، معنی کو اصل اور باطن کی طرف پھیر دینا، وغیرہ، لفظ تاؤیل صیغۂ مصدر ہے، اور اسی کے مادّہ (ا۔ و۔ ل = اول) سے ایک لفظ مُؤَوِّلُ ہے، یعنی تاویل کرنے والا، جیسا کہ مولا علیؑ نے فرمایا: انا مُؤَوِّلُ التّأویل = میں ہی تاویل کرنے والا ہوں۔

مثال : اَدَّلَ اللّٰہُ علیک ضَاۤلَّتُکَ ۔ خدا تیری کھوئی ہوئی چیز کو تیری طرف لوٹا دے۔ پس تاؔوِیلُ کسی بات کو اس کی اصل کی طرف پھیرنے کو کہتے ہیں، جیسے ارشادِ قرآنی ہے : وما یعلمُ تاویلَہٗ اِلاَّ اللّٰہُ والرّاسخون فی العلم (۳/۷) حالانکہ اس کی تاویل (یعنی باطنی معنی) خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا یا وہ لوگ جو علم میں دستگاہِ کامل رکھتے ہیں۔

۳۔ قرآنِ پاک میں ہے : وکذٰلک یجتبیک ربُّکَ ویعلّمک مِن تأویل الاحادیث (۱۲/۶) اور اسی طرح (نورانی خواب و روحانیت سے) پروردگار تمہیں برگزیدہ کرے گا اور تمام باتوں کی تاویل (روحانی اصلیت) سکھائے گا۔ یعنی حضرتِ یعقوبؑ نے اپنے فرزند حضرت یوسفؑ سے کہا کہ یہ جو تم نے خواب دیکھا ہے وہ عام نہیں، بلکہ بہت ہی خاص ہے، کیونکہ نورانی خواب اور روحانیت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، جس کے ذریعے سے حضرتِ ربّ العزّت تمہیں علمِ تاویل سکھانا چاہتا ہے۔

۴۔ فرمایا گیا ہے : وکذٰلک مکّنّا لیوسفَ فی الارض ولنعلّمہٗ من تاویل الاحادیث (۱۲/۲۱) اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو زمین (عالمِ شخصی) میں جگہ دی اور غرض یہ تھی کہ ہم ان کو تاویل سکھائیں۔ یعنی ان کو زمینِ روحانیت خصوصاً ارضِ نفسِ کُلّی میں جگہ دی گئی، اور اسی کی بدولت علمِ تاویل (علمِ لدنّی) ملا، ورنہ مصر میں جگہ

دینے سے تاویل کی کیا نسبت ہو سکتی تھی، یاد رہے کہ عقلِ کُل آسمان ہے، اور نفسِ کُل زمین، یہ دونوں مل کر بھی ہیں، اور الگ الگ بھی (۲۱/۳۰)۔

۵۔ سورۂ یوسف ہی میں حکایتاً ارشاد ہے: قالوا اضغاثُ احلامٍ ج وَما نحنُ بتاویل الاحلام بعٰلمین (۱۲/۴۴) انھوں نے کہا یہ تو پریشان سے خواب ہیں اور ہمیں ایسے خوابوں کی تاویل نہیں آتی (جو بکھرے ہوئے ہیں) مطلب یہ ہے کہ اگر خواب ان کے بقول مربوط ہوتا تو وہ اس کی تاویل کرتے۔

۶۔ حضرت یوسف علیہ السّلام کے ساتھ جو دو جوان قیدخانہ میں داخل ہوئے تھے، انہوں نے گزارش کی کہ: ہمیں ان خوابوں کی تاویل بتا دیجئے کہ ہم آپ کو نیکوکاروں میں سے دیکھتے ہیں (۱۲/۳۶) یوسفؑ نے کہا کہ: تمہارا کوئی کھانا جو تم کو ملنے والا ہے ایسا نہیں جس کی تاویل میں تم کو پیشگی طور پر نہ بتا سکوں، یہ ان باتوں میں سے ہیں جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہیں (۱۲/۳۷) یہاں پر تاویل سے متعلق ایک بہت ہی عظیم راز منکشف ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرتِ یوسفؑ اپنی روحانیت و نورانیت کی روشنی میں نہ صرف گذشتہ باتوں کی تاویل کر سکتے تھے، بلکہ اس روحانی رزق (یعنی علم) کی پیشگوئی کرنے کی بصیرت بھی رکھتے تھے، جو مومنین کو ملنے والا ہے، کیونکہ پیش گوئی بھی تاویل ہی ہوتی ہے، جب کہ

کسی بات کو روحانی مشاہدات و تجربات کی طرف لوٹا کر کہنا پڑتا ہے کہ آگے چل کر ایسا ہوگا، یا اب ہو رہا ہے۔

۷۔ تمام دینی امور کی تصدیق صاحبِ تاویل کے علم سے ہوتی ہے، اس معنے میں حضرتِ یوسفؑ کو صدّیق کہا گیا ہے (۱۲/۴۶) اور قرآنِ حکیم میں جہاں جہاں صِدق سے متعلق الفاظ آئے ہیں، جیسے صادقین، صدّیقین وغیرہ، ان میں تاویل کا ذکر فرمایا گیا ہے، جیسا کہ سُورۂ توبہ میں ارشاد ہے: اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ ہو جاؤ (۹/۱۱۹) اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اہلِ ایمان سب کے سب عام طور پر سچ نہ بولا کرتے تھے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ائمۂ طاہرینؑ کے ساتھ ہو جائیں، تاکہ تاویلی حکمت کی دولت سے مالا مال ہو جائیں۔

۸۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ تاویل گزشتہ اور آئندہ تمام حالات پر محیط ہوتی ہے، چنانچہ حضرتِ یوسف نے کہا: وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ (۱۲/۱۰۰) اور یوسف نے کہا ابّا جان یہ میرے اس خواب کی تاویل ہے جو میں نے پہلے (بچپن میں) دیکھا تھا، یعنی تاویل کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے، کہ کبھی تاویلی پیش گوئی کے لئے مستقبل کو دیکھنا پڑتا ہے، اور کبھی اصل اشارہ کے لئے ماضی کی طرف جانا ضروری ہوتا ہے، حضرتِ یوسفؑ نے شکر گزاری اور دعا و ثنا کے طور پر کہا: اے میرے پروردگار تو نے مجھ کو (روحانی)

سلطنت سے بہرہ ور کیا ہے ... (۴/۱۰۱) یہاں پہلے روحانی بادشاہی کا ذکر ہے، پھر اس کے بعد تاویل کا، کیونکہ پہلے تو ارضِ نفسِ کُلّی کی بادشاہی عطا ہو جاتی ہے، پھر پانچ حدودِ عُلوی کی تائید سے علمِ تأویل کی روشنی آتی رہتی ہے۔

۹۔ ... ذالک خیرٌ واحسنُ تاویلاً (۴/۵۹) مومنو! خدا اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحبانِ امر ہیں ان کی بھی، اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسولؐ (اور صاحبانِ امر) کی طرف رجوع کرو، اگر خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہت اچھی بات ہے اور تأویل (یعنی رجوع اور باطنی حکمت) کے لحاظ سے بھی بہت عمدہ ہے (آیۂ اطاعت کی تشریح و تاویل کے لئے دیکھیں: مفتاح الحکمت، ص ۲۲-۲۴ اور نقوشِ حکمت، ص ۵۱۔)

۱۰۔ ... وَاَوفُوا الکیل اذا کِلتُم وَزِنوا بالقِسطاسِ المستقیم ط ذالک خیرٌ واحسن تاویلا (۱۷/۳۵) اور جب (کوئی) ماپ کر دینے لگو تو پیمانہ پورا کرو اور (جب تول کر دو تو) ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور تاویل کے لحاظ سے بہترین ہے، الکیل عقلِ کُلّ ہے، اور القِسطاس نفسِ کُلّ، نیز الکیل مرتبۂ ناطق ہے، اور القسطاس مرتبۂ اساس۔

۱۱۔ ... ھل ینظرون اِلّا تاویلہ ط یوم یَاْتی تاْویلہ

.... (۵۳/۷) اور ہم نے ان کے پاس کتاب پہنچادی ہے... کیا یہ لوگ سوائے اس کی تأویل کے (اور کسی چیز کا) انتظار کرتے ہیں؟ جس دن اس کی تاویل آئے گی ...۔

۱۲۔ بل کذّبوا بما لم یُحیطوا بعلمہٖ ولمّا یأتھم تأویلُہٗ (۱۰/۳۹) حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر قابو نہیں پاسکے اس کو (نادانی سے) جھٹلا دیا اور ابھی اس کی تأویل ان کے پاس نہیں آئی ہے، اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے بھی تکذیب کی تھی (۱۰/۳۹)۔

نصیرُ الدّین نصیرؔ ہونزائی، امریکہ۔
۹ محرم الحرام سنہ ۱۴۱۲ھ
۲۱ جولائی سنہ ۱۹۹۱ء

سابقہ تاریخ
۹ اکتوبر سنہ ۱۹۸۲ء

Institute for Spiritual Wisdom Luminous Science
Knowledge for a united humanity

حضرتِ موسیٰؑ کے نو معجزات

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰ علیہ السّلام کو نو کھُلے معجزے عطا کر دیئے تھے (۱۷/۱۰۱، ۲۷/۱۲) وہ یہ ہیں: عصا، یدِ بیضا، قحط، طوفان، ٹڈی، چیچڑی، مینڈک، خون اور میووں کی کمی، یہ عظیم معجزات اگرچہ ظاہری اور حسّی قسم کے تھے، لیکن ان میں سے ہر معجزے کا ایک روحانی اور تاویلی پہلو بھی ہے، جس کا ہم ذیل میں (ان شاء اللہ تعالیٰ) کچھ تذکرہ کریں گے:۔

۱۔ پروردگارِ عالم کی جانب سے کسی پیغمبر کا مُعجزہ اس معنیٰ میں ہوتا ہے کہ وہ منکرین کو عاجز کر دیتا ہے، چنانچہ حضرتِ موسیٰؑ کا پہلا مُعجزہ عصا تھا (۲/۲۰، ۷/۱۱۷، ۷/۱۶۰، ۲۶/۶۳، ۲۷/۱۰، ۲۸/۳۱، ۷/۱۰۷، ۲۶/۳۲، ۲۶/۴۵، ۲۰/۱۸) اس لاٹھی کی تاویل اسمِ اعظم اور اس کا زندہ معجزہ ہے، یعنی نورانی ذکر اور یادِ الٰہی، جو سب سے اعلیٰ اور سب سے بزرگ ہونے

کی وجہ سے کائناتی طاقت کا سرچشمہ ہے، یقیناً اسمِ اعظم ہی ہے، جس کی حیثیت میں نورِ نبوّت اور نورِ امامت اپنا سارا کام کرتا رہتا ہے، نیز لاٹھی کی دوسری تاویل مظاہرۂ عقل ہے، پس مقامِ روح پر اسمِ اعظم اور مقامِ عقل پر نورِ علم عصائے موسیٰؑ اور اژدھا کی طرح کام کرتا ہے، جس سے شرّ اور تضاد کی تمام قوتیں نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔

۲۔ یدِ بیضا کا معجزہ ہے نورِ ابیض کو ہاتھ میں لینا، کتابِ مکنون کو چھونا اور یہاں قرآنِ کریم کا اشارہ یہ ہے کہ روحانی اور باطنی معجزات کا تعلّق صرف ناظرین ہی سے ہے (۷/۱۰۸، ۲۶/۳۳) یعنی ان کو صرف چشمِ بصیرت ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔

۳۔ قحط براہِ راست عذاب کے معجزوں میں سے تھا، جس کی تاویل یہ ہے کہ جو لوگ ہادیٔ برحق کے علم سے انکار کرتے ہیں، وہ ہمیشہ کے لئے علمی قحط میں گرفتار رہتے ہیں، کیونکہ علم کا سرچشمہ صرف وہی ہوتا ہے۔

۴۔ طوفان انسانِ کامل کی ذاتی قیامت کا نام ہے، جس میں علم کی انتہائی شدید بارش اور روحوں کا عالمگیر طوفان برپا ہو جاتا ہے اس کے لئے کشتیٔ نجات یہ ہے کہ لوگ ھادیٔ زمان کو پہچانیں، تاکہ وہ غرقابی سے بچ جائیں، یہ عالمِ ذرّ کا واقعہ ہے۔

۵۔ ٹڈیاں (جراد، واحد، جرادہ ۷/۱۳۳) یعنی ایسی بُری روحیں

جو شکوک و شبہات اور متضاد خیالات کی صورت میں دینی اور اعتقادی فصل کو تباہ کر دیتی ہیں، جس طرح جسمانی ٹڈیاں ظاہری فصل کو برباد کرتی ہے۔

۶۔ چیچڑیاں (قُمَّلَ واحد، قُمَّلَة ۷/۱۳۳) یہ بھی عذاب کے معجزات میں سے ہے کہ بعض بُری روحیں چیچڑیوں کی طرح آدمی کے ظاہر و باطن میں چمٹ کر اذیت دیتی ہیں، یہ آزمائش ہے کہ جسمِ لطیف کو مانتے ہو یا نہیں؟

۷۔ مینڈک (ضفادِع، واحد، ضفدِع ۷/۱۳۳) ایسی روحوں کا شور و غُل، جس کی وجہ سے اعلیٰ روحوں اور فرشتوں کی آوازیں سُنائی نہیں دیتی ہیں، پھر بھی یہ معجزہ حیران کُن ہے۔

۸۔ دَمّ (خون، جمع، دِماء ۷/۱۳۳) پانی کا خون ہونا، یہ بھی ایک عقلی عذاب ہے، کہ کسی نادان شخص کی نظر میں حقیقی علم مشکوک اور بُرا لگتا ہے، اس کا مطلب ہے، کہ پاک پانی اس آدمی کے لئے خون ہو گیا، اب اس کی پیاس بجھانے کے لئے دوسرا پانی نہیں ملے گا، پس یہ بھی ایک باطنی عذاب تھا کہ فرعون اور اس کی قوم کو حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کا آبِ علم خون جیسا ناگوار لگ رہا تھا۔

۹۔ پھلوں کی کمی (ثمرات، واحد، ثمر ۷/۱۳۰) اگر کوئی شخص دینی طور پر عاقل و دانا اور ذہین ہے، تو اس کے پاس فکری نتائج کے میووں کی فراوانی ہے، اور جس کو نورِ ہدایت سے دشمنی ہو، اس کے

ہاں کوئی ایسا علمی پھل نہیں، پس خدا کی طرف سے یہ بھی ایک سزا ہے۔

۱۰۔ آیاتِ تسعہ (نو معجزات) کی تاویلی حکمت بے حد ضروری ہے، اس میں کلیدی حکمتیں موجود ہیں، اور یہاں سے آپ کو بڑا تعجب ہوگا کہ بعض معجزات باعثِ عذاب اور بعض باعثِ ثواب ہوا کرتے ہیں، اور یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ در و دیوار کے اندر رحمت ہے اور باہر عذاب (۵۷/۱۳) یا اللہ جیسا کہ تو نے فرمایا ہے (۳۳/۴۳) محمدؐ و آلِ محمدؐ کے وسیلے سے مومنین پر ایسا درود بھیج کہ اس میں حقیقی علم کی روشنی ہو! آمین!!

نصیر الدین نصیر ہونزائی، امریکہ۔
۱۱ محرم الحرام ۱۴۱۲ھ
۲۲ جولائی ۱۹۹۱ء
سابقہ تاریخ
۲۲ جولائی ۱۹۸۲ء

سورۂ عادیات کی چند حکمتیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ترجمہ: (غازیوں کے) سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ٹھوکروں سے فراٹے نکالتے ہیں ① پھر پتھر پر ٹاپ مار کر چنگاریاں نکالتے ہیں ② پھر صبح کے وقت تاخت و تاراج کرتے ہیں ③ پھر اس وقت غبار اڑاتے ہیں ④ پھر اس وقت (دشمنوں کی) جماعت میں جا گھستے ہیں ⑤ بیشک انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے ⑥ اور وہ خود بھی اس حالت پر گواہ ہے ⑦ اور وہ (دُنیوی) راحت کی محبّت میں بڑا مضبوط ہے ⑧ تو کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ جب مُردے قبروں سے اٹھائے جائیں گے ⑨ اور حاصل کیا جائے گا جو کچھ دلوں میں ہے ⑩ بے شک اس دن ان کا پروردگار ان سے پورا آگاہ ہے (یعنی انہیں آگاہ کر دے گا) ⑪

حکمت ۱ : ظاہری جہاد کا گھوڑا ایک حیوان ہے لیکن باطنی جہاد کا گھوڑا اوّل ذکرِ الٰہی ہوا کرتا ہے، اور دوسرا علم، جو دونوں مختلف سطحوں پر بلند ہو جاتے ہیں، اور جب ذکر اور علم خود بخود بولنے لگتا ہے، تو وہ داعی کہلاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کتابِ وجہِ دین میں گھوڑے کی تاویل داعی ہے، جو عالمِ شخصی میں پوشیدہ ہے، چونکہ اذکار میں سب سے مؤثّر اور کامیاب ذکرِ سریع ہی ہے، لہٰذا خداوندِ دانا و بینا اسی کی قسم کھاتا ہے، گھوڑے کے نتھنوں سے فراٹے نکالنے کی تاویل ہے، ذکر کی سُرعت و سختی سے نفس پر دباؤ ڈالنا، نیز اپنے ذکر کی آواز میں مستغرق ہو جانا۔

حکمت ۲ : پتّھر پہ ٹاپ مار کر چنگاریاں نکالنا، یعنی تحلیلِ نفسی کی چنگاریاں، جو ذکرِ سریع کے نتیجے میں پیدا ہو جاتی ہیں، یہ مقامِ روح کی تاویل ہے، اور مرتبۂ عقل کی حکمت اس سے بڑھ کر ہے، کیونکہ وہاں سنگِ عقل پر ٹاپ مارنے سے جواہرِ اسرار بکھر جاتے ہیں۔

حکمت ۳ : صبح کے وقت تاخت و تاراج کرنے کا پُرحکمت اشارہ یہ ہے کہ صبح کی کار بزرگی اور خصوصی بندگی روحانی جہاد کا درجہ رکھتی ہے، جس سے باطنی مالِ غنیمت کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آتا ہے (۴۸/۲)

حکمت ۴ : غبار اُڑانا، یاد رہے کہ روحانی جہاد اور صورِ اسرافیل کی طوفانی طاقت سے جس طرح خلائقِ عالم کی تمام روحیں عالمِ ذرّ میں جمع کی جاتی ہیں، وہ حسبِ وعدۂ الٰہی مغانمِ کثیرہ (بہت سی غنیمتیں ۴۸/۲۰) ہیں، اور عملِ عزرائیل سے روح کو قبض کرنا گویا غبار اڑانا ہے۔

حکمت ۵ : یہ تو صرف روحانی فتح تھی، اب عقلی فتح کے لئے ایک اور جنگ لڑی جاتی ہے، جس کے واسطے اعلیٰ اور کثیر علم کی ضرورت ہے، تاکہ علمی لشکر دشمن کی جماعت میں جا گھسے، اور غالب و فاتح ہو جائے۔

حکمت ۶ : انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے، کیونکہ وہ مذکورۂ بالا تمام نعمتوں اور عظیم روحانی سلطنت کے حصول کی خاطر سعیٔ بلیغ نہیں کرتا ہے، نہ وہ ذکر و بندگی اور علم و حکمت کے لئے محنت کرتا ہے، جیسا کہ اس کا حق ہے۔

حکمت ۷ : انسان کئی معنوں میں اپنے کُفرانِ نعمت (نعمت کی ناشکری) کو جانتا ہے، کیونکہ وہ خود اپنی روحانی پس ماندگی کو دیکھ رہا ہے، اور دین کی روشن ہدایات و تعلیمات اس کے سامنے ہیں۔

حکمت ۸ : حالانکہ وہ دنیا کی راحت کو بیحد چاہتا ہے، یعنی وہ ایسا بے حس نہیں کہ روحانیت اور آخرت کی نعمتوں کے

بارے میں کچھ بھی نہ سمجھے، وہ سمجھتا ہے، مگر اس کے پاس بے عملی کے حیلے بہانے بہت ہیں۔

حکمت نمبر ۹: کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ روح جب تک بدن میں ہے، تب تک وہ گویا قبر میں ہے، لہٰذا اسے یہاں سے اٹھانا اور بلند کر دینا ہے۔

حکمت نمبر ۱۰: اسی طرح جب کسی مومن کی انفرادی قیامت برپا ہوگی، تو اس وقت حدودِ دین (صُدور = قلوب) سے اسرارِ معرفت حاصل کئے جائیں گے۔

حکمت نمبر ۱۱: بے شک ربِّ کریم ہر مومنِ سالک کی ذاتی قیامت میں اس پر عظیم بھیدوں کا دروازہ کھول دیتا ہے، تاکہ اسے کامل معرفت حاصل ہو۔

نصیر الدین نصیر ہونزائی، امریکہ۔

۲۵ر جولائی ۱۹۹۱ء

۱۴ محرم الحرام ۱۴۱۲ھ

سُورۂ قارعہ کی چند حکمتیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ترجمہ : کھڑکھڑانے والی ① وہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے ② اور تم کو کیا معلوم کہ وہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے ③ جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے ④ اور پہاڑ دُھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے ⑤ پھر جس شخص (کے علم و عمل) کا پلّہ بھاری ہوگا ⑥ وہ دل پسند عیش میں ہوگا ⑦ اور جس شخص کا پلّہ ہلکا ہوگا ⑧ تو اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا ⑨ اور تم کو کیا معلوم کہ ہاویہ کیا ہے ⑩ (وہ) دہکتی ہوئی آگ ہے ⑪

حکمت ۱ : القارعہ، کھڑکھڑانے والی، یعنی روحانیت اور ذاتی قیامت کی صدا، کانوں کو کھٹکھٹانا، خانۂ وجود کے دروازے پر بیرونی روحوں کی دستک وغیرہ، کیونکہ قیامت کی

بے شمار مثالیں ہیں، اور ان میں سے ایک یہ کہ دروازۂ دل کھولنے کے لئے زبردستی سے کھڑکھڑایا جاتا ہے۔

حکمت ۲: اس عجیب و غریب واقعہ کی طرف بھرپور توجہ دلانے کی غرض سے سوال فرمایا گیا ہے، اور خدا کے سوال میں بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔

حکمت ۳: یقیناً لوگ واقعاتِ قیامت سے غافل اور بے خوف ہیں، حالانکہ پوری زندگی میں اسی کی فکر اور عملی تیاری ہونی چاہیئے۔

حکمت ۴: جس دن لوگ ایسے ہوں گے، جیسے بکھرے ہوئے پروانے، یعنی ارواحِ خلائق ذرّاتِ لطیف میں منتشر ہوں گی، اور یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ روحانیت و قیامت "عالمِ ذر" میں موجود ہے، جو جسمِ لطیف کے ذرّات کا عالم ہے، اس آیۂ کریمہ میں پروانوں کی مثال کئی حکمتوں کی حامل ہے، اوّل یہ کہ جس طرح بعض کیڑوں مکوڑوں کا حشر پروانوں اور پتنگوں کی صورت میں ہوتا ہے، اسی طرح کامل انسانوں کی قیامت مکمل جسمِ لطیف میں ہوتی ہے، اور دوسرے انسانوں کو ذرّاتِ لطیف میں محشور کیا جاتا ہے، اس مثال کی دوسری حکمت یہ ہے کہ جہاں انسانِ کامل میں قیامت برپا ہو جاتی ہے، وہاں نورِ اسمِ اعظم کی طرف تمام روحیں آکر پروانوں کی طرح بکھر جاتی

ہیں، جیسے پتنگے چراغ کے گرد اگرد جمع ہو جاتے ہیں۔

حکمت ۵: جب تک روحانیت دقیامت کا عالم نہ ہو، تب تک ہر آدمی کی روح پہاڑ کی طرح منجمد رہتی ہے، مگر قیامت کے برپا ہو جانے سے کوہِ روح کا جمود کلّی طور پر ٹوٹ جاتا ہے، اور جبلِ روح نہ صرف ریزہ ریزہ ہو کر لاتعداد لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے، بلکہ اس میں دلاویز لطافت و رنگینی بھی پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ مطلب صبغۃ اللہ (۲/۱۳۸) سے الگ نہیں ہے۔

حکمت ۶: قیامت کے دن ایسے نیک اعمال میں بڑا وزن ہوگا، جو عقل و دانش اور علم و حکمت کے ساتھ کئے گئے ہوں، کیوں کہ خیرِ کثیر حکمت سے وابستہ ہے (۲/۲۶۹) اور دوسری طرف یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کے پاس آج دینی عقل نہ ہو، وہ کل دوزخ میں افسوس کرنے والے ہیں (۶۷/۱۰)

حکمت ۷: جس شخص کے علم و عمل کا پلّہ بھاری ہو، وہ دلپسند عیش میں ہوگا، یہ بہشت کی سلطنت کی طرف اشارہ ہے، جس کا تذکرہ سورۂ دھر (۷۶/۲۰) میں ہے، "عِیشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ" میں چوٹی کی نعمتوں کا ذکر ہے، جس سے جنّت کی بادشاہی مراد ہے۔

حکمت ۸: جس شخص کا پلّہ جاہلانہ اعمال کی وجہ سے ہلکا ہوگا، وہ زیاں کار اور نامراد ہو جائے گا۔

حکمت ۹: ایسے انسان کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا، ہاویہ کے

معنی ہیں دوزخ، گرنے والی، یعنی نادان وجاہل، جو خود گرا ہوا ہے، اور دوسروں کو بھی گرا دیتا ہے۔

حکمت ۱۰: ھاویہ کو تم جانتے ہی نہیں ہو، وہ گرنے اور گرانے کی جگہ ہے۔

حکمت ۱۱: وہ دہکتی ہوئی آگ ہے، یعنی نادان اور اس کی پھیلتی ہوئی عملی نادانی، جو لوگوں کو تباہ کر رہی ہے، کیونکہ جہالت آتشِ دوزخ ہے، جس میں بہت بڑا عقلی عذاب موجود ہے۔

نصیر الدین نصیر ہونزائی
شکاگو (امریکہ)
۳۱ جولائی ۱۹۹۱ء
سابقہ تاریخ
۱۲ ستمبر ۱۹۸۲ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

سُورۂ تکاثر کی چند حکمتیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ ترجمہ : نسل و مال کی بہتات نے تم لوگوں کو غافل بنا رکھا ہے ۔ ① یہاں تک کہ تم نے قبریں دیکھیں ② ایسا نہیں تمہیں عنقریب ہی معلوم ہو جائے گا ③ پھر ایسا نہیں تمہیں عنقریب ہی معلوم ہو جائے گا ④ ایسا نہیں اگر تم علم الیقین جانتے ⑤ تو تم لوگ ضرور دوزخ کو دیکھ لیتے ⑥ پھر تم اس کو عین الیقین (یقین کی آنکھ) سے دیکھ لوگے ⑦ پھر اس روز تم سب سے نعمتوں کے بارے میں ضرور باز پُرس کی جائے گی ⑧

حکمت ۱ : یہ ایک بڑا حکیمانہ اشارہ ہے کہ خدا اور روزِ آخرت سے آدمی اکثر اس وجہ سے غافل رہتا ہے کہ وہ دُنیاوی اور مادّی ترقی میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھ جانے کی خواہش رکھتا ہے، اسی طرح جب انسان کے دل میں دنیا کی حرص و ہوس

کا غلبہ ہوتا ہے، تو اس میں اللہ تعالیٰ کی پاک یاد و محبّت کے لئے کوئی جگہ باقی ہی نہیں رہ سکتی۔

حکمت ۲ : اگر کسی شخص کی غفلت وقتی طور پر ہے، تو اور بات ہے کہ آدمی کو ہوش آنے کے بعد اصلاح ہو سکتی ہے، اور اگر یہ دائمی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کسی دینی کارنامہ کے بغیر قبر میں جائے گا، اور قبر دو قسم کی ہوا کرتی ہے، ایک مردہ قبر ہے، اور دوسری زندہ، چنانچہ ظاہری موت کے بعد جسم کو مردہ قبر میں دفنایا جاتا ہے، مگر روح زندہ قبر میں جاتی ہے، اور خوب غور سے دیکھ لیں کہ یہاں زندہ قبروں کے بارے میں اس طرح ارشاد ہوا ہے: "کہ تم نے قبریں دیکھ لیں"، یعنی تمہاری غفلت کا یہ حال ہے کہ تم جہالت کی موت مر گئے، اور تم نے غیر شعوری طور پر اپنی زندہ قبروں کی زیارت بھی کر لی۔

حکمت ۳ : ایسا نہیں تمہیں عنقریب ہی معلوم ہو جائے گا۔ یعنی تمہارے نظریات اور معلومات درست نہیں، ان میں ایک بار اصلاح کی ضرورت ہے۔

حکمت ۴ : پھر ایسا نہیں تمہیں عنقریب ہی معلوم ہو جائے گا، یعنی تمہارے نظریات و معلومات میں آگے چل کر مزید درستی کی ضرورت ہوگی۔

حکمت ۵ : ایسا نہیں اگر تم علم الیقین جانتے، یعنی یہی تو

خرابی ہے کہ تم علم الیقین نہیں جانتے ہو، کیونکہ جہالت و نادانی اور شکوک و شبہات جیسے مذہبی امراض کا علاج علم الیقین ہی سے ہو جاتا ہے، جبکہ یقین معرفت کا نام ہے، اور علم الیقین ایسے علم کو کہتے ہیں، جس میں روایتی علم کے برعکس معرفت کے چشم دید اسرار کا بیان ہوتا ہے۔

حکمت ۶ : دنیا میں کوئی ایسا علم نہیں، جس سے دوزخ اور بہشت کی ثانوی معرفت اسی زندگی میں حاصل ہو سکے، مگر علم الیقین ہی ہے، کہ وہی آنکھ کا کام دے کر دکھاتا ہے کہ جہالت و نادانی ہی آتشِ دوزخ ہے اور علم بہشت کی نعمت و راحت ہے، تاکہ ہوشمند مومنین اس شناخت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو علم سے خوب آراستہ کریں، اور جہالت سے بچ جائیں۔

حکمت ۷ : جب بندۂ مومن علم الیقین کے مراحل سے گزرتا ہے، اور دوزخ و بہشت کو پہچان لیتا ہے، تو پھر لازمی طور پر وہ وقت بھی آجاتا ہے، جس میں وہ عین الیقین سے جحیم و جنّت کو دیکھ سکتا ہے، تاکہ اس کو یہ بشارت ہو کہ وہ دوزخ سے بچ کر بہشت میں داخل ہونے والا ہے۔

حکمت ۸ : جہاں علم الیقین کی روشنی میں دوزخ (جہالت) ظاہر ہے، وہاں یقیناً دوسری طرف بہشت یعنی خود علم بھی عیان

ہے، اور جب عین الیقین کی منزل آتی ہے، تو اس وقت یہ حقیقت مثلِ خورشید روشن تر ہو جاتی ہے، ایسے حال میں دینی نعمتوں سے متعلق سوالات دنیا میں بھی ہو سکتے ہیں، اور آخرت میں بھی، مثال کے طور پر ایسا لگ رہا ہے، جیسے کوئی فرشتہ پوچھ رہا ہو کہ: تم نے اس کُلّی اور بنیادی نعمت سے کیا کیا کام لیا، جس کا ذکر الیوم اکملتُ (۵/۳) میں ہُوا ہے؟ جیسا کہ ارشاد ہے: آج (یعنی اس دور میں) مَیں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے دینِ اسلام (یعنی تدریجی ہدایت کی فرمانبرداری) کو پسند کیا۔ یہاں یہ نکتہ یاد رہے کہ الیوم سے وہ دَور مراد ہے، جس کا آغاز اعلانِ امامت سے ہوا، کیونکہ یوم دن کو بھی کہتے ہیں، اور دَور کو بھی، آپ تحقیق کر سکتے ہیں۔

نصیرُ الدّین نصیؔر ہونزائی۔ امریکہ۔

۶/ اگست ۱۹۹۱ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

تصوّرِ آفرینش[1] ۔ خط یا دائرہ؟

خطِ مستقیم: ——— خطِ عمودی: | دائرہ: ◯

اِس سلسلۂ موضوع میں سب سے پہلے عنوانِ بالا بُنیادی سوال بن کر سامنے آرہا ہے کہ تصوّرِ آفرینش کی مثال کیا ہے؟ آیا یہ تصوّر خط یعنی لکیر کی طرح ہے یا دائرے کی طرح؟ خط اور دائرے کے درمیان جو کچھ فرق ہے وہ روشن ہے کہ خط کے دو سرے ہیں جو ابتدا اور انتہا کی نشاندہی کرتے ہیں، لیکن اس کے برعکس دائرے کا کوئی سرا نہیں، جس کا اشارہ ہے لا ابتدا و لا انتہا[2]۔

اب اگر ہم مذکورۂ بالا سوال کے جواب میں یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص زمانے میں کارِ تخلیق کا آغاز ایک ایسے فعل کی حیثیت سے کیا جو پہلے کبھی اُس سے صادر نہیں ہُوا تھا، تو

---

[1] آفرینش (آف۔ری۔نِش) پیدائش۔ مخلوق، دُنیا

[2] لا ابتدا و لا انتہا: وہ چیز جو ہمیشہ ہو جسکی ابتدا و انتہا نہ ہو۔

اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تصوّرِ آفرینش کی مثال خط ہے، اور خط کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ابتدائی سرے سے پہلے اور انتہائی سرے کے بعد معدوم[1] ہے، مگر یہ تصوّر قطعاً درست نہیں، کیونکہ اِس نظریّہ کے نتیجے میں ہزاروں ایسے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ اُن میں سے کوئی ایک بھی حل نہیں ہوتا، مثال کے طور پر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم خدائے قادرِ مطلق کے لئے ایک ایسے وقت کا تعیّن کریں، جس میں وہ خالق کہلائے اور مخلوق کا نام و نشان تک موجود نہ ہو، ربِّ کریم ہو مگر کوئی مربوب نہ ملے، رحمان و رحیم جیسے اوصافِ خداوندی فعلاً نہیں صرف برائے نام ہوں، اور خدا کی ہر صفت پہلے حدِّ قوّت میں ہو، پھر اس کے بعد حدِّ فعل میں آئے، ایسی صفات سے اللہ تعالیٰ پاک و برتر ہے، جب کہ اس کی ذات و صفات دونوں قدیم ہیں، اس میں کوئی تغیّر نہیں آتا، اس کی جتنی صفات ہیں، وہ ہمیشہ ایک جیسی ہیں، اور اسی معنٰی میں وہ حادث نہیں بلکہ قدیم ہے۔

اگر ہم نظریۂ تخلیق کی تشبیہ دائرے سے دے کر یہ مانیں کہ خداوندِ عالم کی صفتِ خالقیت بالفعل ایسی قدیم ہے، جیسی اس کی ذات قدیم ہے، تو پھر سارے سوالات ختم ہو جاتے

[1] نیست و نابود کیا گیا۔

ہیں، آئیے ہم اِس تصوّر کے حق ہونے کی شہادتیں قرآنِ پاک اور آفاق وانفس سے لیتے ہیں :-

قرآنِ حکیم کے حکمتی مفہومات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر علم یا عمل کے چند طریقے ہمارے سامنے ہیں تو ہمیں ان میں سے بہترین کو اختیار کر لینا چاہئے، آپ اِس مفہوم کے لئے قرآنِ پاک میں لفظِ "احسن" کو دیکھ سکتے ہیں، خاص کر ۱۴۵/۷ اور ۳۹/۵۵ میں، مگر ترجموں میں فرق ہوگا، اِس لئے غور و فکر سے کام لینا ہوگا، بہرکیف تخلیق کا احسن تصوّر دائرے کی شکل میں ہے، کہ اس میں کوئی نقص نہیں، وہ عقل و منطق اور علم و حکمت کی تمام تر خوبیوں سے آراستہ ہے۔

اگر خداوندِ عالم کی خدائی، بادشاہی اور فعلِ تخلیق بصورتِ دائرہ کسی ابتدا و انتہا کے بغیر نہ ہوتی تو قرآنِ حکیم اور کائناتِ ظاہر میں دائرے ہی دائرے نظر نہ آتے، یعنی قانونِ فطرت کی ہر چیز گول نہ ہوتی، اس کی بجائے کسی اور شکل کی بہت بڑی اہمیّت ہوتی، مگر آپ دیکھتے ہیں کہ زمان و مکان کی تمام اشیاء اور ان کی حرکتیں گول ہیں، جیسے آسمان، زمین، سورج، چاند، ستارے، پانی، ہوا وغیرہ، قرآنِ عزیز میں جس طرح دائروں کا قانون ملتا ہے، وہ مثال کے طور پر یوں ہے کہ رات اور دن میں سے ایک آگے اور ایک پیچھے نہیں، بلکہ

یہ دونوں کرّۂ ارض پر بیک وقت واقع ہیں، جو دو قوس (کمان) کی طرح ہیں کہ ایک دوسرے سے ملکر مکمل دائرہ بناتی ہیں، جیسے نقشۂ ذیل سے یہ حقیقت ظاہر ہے:-

$\frac{3}{27}$ ، $\frac{39}{5}$ ، $\frac{23}{80}$ ، $\frac{13}{3}$ ، $\frac{36}{40}$

ارشاد فرمایا گیا ہے: تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے، تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بے جان پیدا کرتا ہے (۳/۲۷) نیز سورۂ یٰسٓ (۳۶/۴۰) میں یہ واضح مفہوم ہے کہ نہ تو رات دن سے آگے ہے اور نہ ہی دن رات سے، بلکہ ہر چیز ایک دائرے پر گردش کر رہی ہے۔

دن رات اور حیات و ممات کے اِس کلّیہ سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ عالمِ امر اور عالمِ خلق (آخرت اور دنیا) میں سے کوئی ایک زمانی طور پر آگے اور ایک پیچھے نہیں، بلکہ وہ دائرۂ وجود پر ہمیشہ سے دن رات کی طرح ایک ساتھ واقع ہیں، اور یہ بات الگ ہے کہ عالمِ آخرت کو دنیا پر تقدّم

شرفی حاصل ہے، یعنی وہ شرف کے لحاظ سے آگے ہے، مگر وقت کے لحاظ سے نہیں، چنانچہ جب قانونِ فطرت کی بنیاد میں عالمِ امر اور عالمِ خلق روز و شب کی طرح ایک دوسرے سے پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور سب سے عظیم دائرہ بناتے ہیں، تو پھر کون سی چیز دائرے کے بغیر باقی رہ سکتی ہے، سو یہ تصور ایک یقینی حقیقت ہے کہ کارِ تخلیق کی مثال دائرہ ہے، جس کی ابتدا و انتہا کا کوئی سرا نہیں۔

فرمانِ الٰہی ہے: وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۴۰) اور ہم ان ایام (یعنی زمانے) کو لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہا کرتے ہیں۔ اس خدائی قانون میں نہ صرف بے پناہ زمانوں کو بلکہ عرصۂ وجود کے تمام لوگوں کو بھی گردشِ ایام کے دائرے پر پیش کیا گیا ہے، اور اس میں یہ دُور رس مفہوم بھی رکھا ہوا ہے کہ سعادت و شقاوت بھی زمانہائے دراز کی گردش میں آتی جاتی رہتی ہے۔

قرآنِ حکیم میں لا انتہائی کے دائرے ہی دائرے ہونے کی ایک خاص صورت یہ ہے کہ کبھی تو چیزوں کا تذکرہ عالمِ جسمانیت سے آغاز کر کے عالمِ روحانیت میں پہنچ جاتا ہے اور پھر وہاں سے لوٹ کر اس دنیا میں آتا ہے، جیسے قصۂ آدمؑ کہ وہ اِس دنیا میں پیدا ہوا، پھر بہشت میں داخل کیا گیا، پھر

وہاں سے دنیا میں بھیجا گیا، اسی طرح اس کا ایک چکّر تو مکمل ہو گیا، یعنی اِس سے دائرے کا ثبوت مل گیا، اور پھر کبھی کسی چیز کا ذکر عالمِ ارواح سے شروع ہو کر عالمِ اجسام میں آتا ہے اور یہاں سے واپس وہاں جاتا ہے، جہاں سے بات شروع ہوئی تھی، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: موسیٰؑ نے کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے عالمِ امر کی ہر چیز کو عالمِ خلق میں ایک صورت دی، پھر اسے اصل مقام پر پہنچا دیا (۲۰/۵۰ مفہوم)، مگر یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ صرف ایک ہی آیت میں دائرے کی بات آئے، بلکہ متعلّقہ موضوع کی ایک سے زیادہ آیتوں سے بھی یہی ثبوت ملتا ہے، جیسے ۱۷/۸۵ میں ارشاد ہے کہ روح عالمِ امر سے آئی ہے، اور ۸۹/۲۷-۳۰ میں اس کی مَراجعت کا ذکر ملتا ہے، پس روح کا اِس دنیا میں آنا ایک قَوس (کمان) ہے اور عالمِ بالا کی طرف لوٹ کر جانا دوسری قوس ہے اور دو قوس سے دائرہ بن جاتا ہے۔

حکمائے دین کا کہنا ہے کہ نیستی (NOTHING NESS) ابداع کا دوسرا نام ہے (بحوالۂ زاد المسافرین تصنیفِ حکیم ناصر خسرو) اور عدمِ محض جیسی کوئی چیز نہ کبھی پہلے تھی نہ اب ہے اور نہ ہی بعد میں کبھی ہوگی، یعنی خدا کی قدیم بادشاہی میں ایک طرف عالمِ امر ہے، جس میں "کلمۂ کُن" کی کارفرمائی ہوتی رہتی ہے، جو طریقۂ ابداع کہلاتا ہے اور دوسری طرف عالمِ خلق ہے،

ISW Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

جس میں ہمیشہ سے خدا کی تخلیق جاری ہے، اس منطق سے یہ حقیقت صاف طور پر روشن ہوئی کہ خدائی میں کبھی کوئی ایسا وقت نہیں گزرا ہے، جس میں کہ اس کی مخلوق موجود نہ ہو۔

حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "یہودی تصوّرِ آفرینش اور اسلامی تصوّرِ آفرینش میں بنیادی فرق ہے، اسلامی تصوّر کے مطابق تخلیق ایک وقتِ معین میں کسی منفرد عمل سے عبارت نہیں بلکہ وہ ایک دائم اور مسلسل واقعہ ہے۔" امامِ عالیمقام کے اِس مبارک ارشاد میں "دائم اور مسلسل" کا مطلب ہے ابتدا اور انتہا کے بغیر، جس کا نمونہ دائرہ دائمیّت ہے۔

یہ بھی عملاً دائرے ہیں

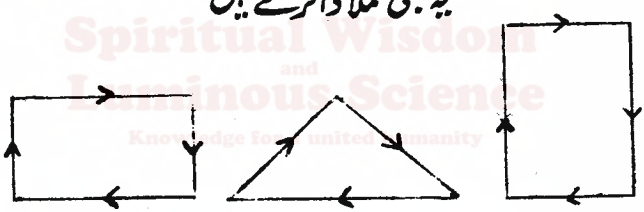

اِس دنیا میں اور خود انسان کی ہستی میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو ظاہراً دائرہ نہیں لگتی ہیں، مگر ذرا غور سے ان کے فعل کو دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ دائرے کی طرح کام کرتی ہیں، مثال کے طور پر ایک ایسے پل کو لیجئے جو دو شہروں

کو ملاتا ہے، جس کی ایک طرف سے لوگ جاتے ہیں اور دوسری طرف سے آتے ہیں، تو یہ بھی دائرۂ دائمیت کا ایک نمونہ ہے، اسی طرح آدمی کا سانس ہے جو حیات و بقا کے اُس پُل کی مثال ہے، جو لوگوں کے آنے جانے کے لئے دونوں جہان کے درمیان بنایا گیا ہے، جس پر لوگ ہمیشہ آتے جاتے رہتے ہیں، نیز انسان کے اندر حرکتِ قلب ہے جو اگرچہ فعلاً پمپ کی طرح نظر آتی ہے مگر اس سے دورانِ خون کا جو نظام قائم ہے، وہ بشکلِ دائرہ جاری ہے، تاکہ عقل والے اس رازِ فطرت میں غور کر سکیں کہ ہر چیز دائرے سے وابستہ کیوں ہے اور ایک ہی شئی بار بار کیوں سامنے آتی رہتی ہے۔

کوئی شخص یہ کہے گا کہ انسان یعنی روح اِس دنیا میں بار بار آتی رہتی ہے، دوسرا کوئی اس کی تردید کرتے ہوئے کہنے لگے گا کہ نہیں، روح صرف ایک بار یہاں آتی ہے، یہ دونوں باتیں محدود ہیں، میں امامِ اقدس و اطہرؑ کے خزانے سے اِس سلسلے کی ایک بات بتاؤں گا جو اِن شاء اللہ بہت ہی عظیم ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ روحِ انسانی اِس دنیا میں ایک اعتبار سے بار بار آتی بھی ہے اور دوسرے اعتبار سے نہیں بھی آتی ہے۔

آپ بتائیں تو سہی کہ دنیا اور آخرت کے درمیان کتنی مسافت ہے؟ آخرت یا عالمِ بالا کہاں ہے یا کیا ہے؟ آیا وہ

کوئی مادّی عالم ہے یا روحانی؟ آخرت کے ان بنیادی مسائل کے علم کو حاصل کئے بغیر دُنیا میں بار بار آنے کی بحث میں پڑنا بے سود ہے، چنانچہ جاننا چاہئے کہ دنیا جسم ہے اور آخرت جان، بس اِسی ایک جملے میں تمام جوابات مہیّا ہو گئے، آپ دیکھ کر تسلّی کرلیں، پس آپ یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھیں کہ جسم کی نگاہوں سے جو کچھ نظر آتا ہے وہ دُنیا ہے، اور روح کی آنکھوں سے جس عالم کا مشاہدہ ہوتا ہے وہ آخرت ہے، اور اس حقیقت کی ایک ادنیٰ مثال عالمِ خواب ہے۔

اس مادّی دنیا میں ایسے بہت سے خوش نصیب اشخاص ہو گزرے ہیں اور اب بھی ہو سکتے ہیں جنہوں نے نورِ ہدایت کی روشنی میں چل کر اسی زندگی میں آخرت کا مشاہدہ کیا، یہ بات ایسی ہے جیسے کوئی شخص دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں گیا، اور ہر کامل انسان اسی پوزیشن میں ہوا کرتا ہے، جب دنیا میں یہ بات ممکنات میں سے ہے کہ کوئی شخص جسم سے مادّی عالم میں رہے اور روح سے روحانی عالم کو پائے، تو آخرت کے معجزات کا کیا عالم ہوگا، چنانچہ وہاں ہر مومن لطیف جسم میں ہوگا، وہ جسم اِس خاکی جسم سے قطعاً مختلف اور معجزاتی نوعیت کا ہے، اس کی دو طرفہ (ظاہری و باطنی) آنکھوں کے سامنے دنیا بھی ہے اور آخرت بھی، تو پھر وہ جسمِ عنصری میں قید ہو کر

کیوں آئے، اور جنّۃ ابداعیّہ میں کیوں نہ آئے، یہی ہے روح کی وہ حقیقت جس میں کہ انسان ایک اعتبار سے اِس دنیا میں بار بار آنا کیا بلکہ ہمیشہ موجود ہے اور دوسرے اعتبار سے نہیں آتا، یعنی وہ موجودہ جسمانی زندگی کی طرح یہاں قید نہیں ہوتا، کیونکہ اس کی زیادہ سے زیادہ حلاوت و لذّت اور مسرّت و شادمانی روحانی نعمتوں میں ہے۔

یہی حقیقت دوسری مثال میں بھی پیش کی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ بحکمِ حدیثِ صحیح: اَلْمُؤْمِنُ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ (مومن نورِ خدا کی روشنی میں دیکھتا ہے) اور نورِ خدا کی روشنی سے آسمان و زمین اور دنیا و آخرت منوّر ہیں، سو اگر مومن دنیا میں ہے تو وہ آخرت کو بھی دیکھ سکتا ہے، اور اگر آخرت میں ہے تو آخرت کے علاوہ دُنیا کو بھی دیکھ سکتا ہے، اگر مومن دنیا میں کسی قدر کمزور ہے تو کل اِن شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔

رسول، نبی اور امام جیسے الفاظ خاص ہیں، ان میں اُمّت کی کوئی شرکت نہیں، مگر لفظِ "مومن" پیغمبر، امام اور اُمّت کے درمیان مشترک ہے، لہٰذا یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ رسولِ خداؐ اور امامِ برحقؑ کے توسّط سے کامیاب مسلمین یعنی مومنین اِس خدائی نور کی آنکھ سے دونوں جہان کو دیکھ سکتے ہیں۔

کُلّیات اور جزئیّات کے درمیان اصولی فرق یہ ہے، کہ ہر کُلّ متضاد معنوں، باتوں یا صفتوں کا متحمل ہو سکتا ہے، جب کہ کوئی جُزو اس کی اہلیّت نہیں رکھتا، مثلاً اگر ہم کہیں کہ پانی ٹھنڈا بھی ہے اور گرم بھی، تو یہ بات کُلّ پانی کے متعلّق بالکل صحیح ہوتی ہے مگر جہاں گلاس بھر پانی ہو، وہاں یہ بات غلط ہو جاتی ہے، جس کی وجہ ظاہر ہے کہ جُزو میں وہ عظمت اور وسعت نہیں جو کُلّ میں ہے، اسی طرح اگر کہا جائے کہ بیک وقت دن بھی ہے اور رات بھی، تو یہ متضاد بات سیّارۂ زمین سے متعلّق درست ہے، کہ اس پر ایک طرف دن اور دوسری جانب رات ہوا کرتی ہے، مگر یہ بات کسی محدود علاقے پر صادق نہیں آ سکتی ہے، اور ایسی مثالیں بہت زیادہ ہیں، پس کلیّات کے علم کو حاصل کرنا چاہیئے، جیسا کہ حکیم پیر ناصر خسرو قدس کا قول ہے:۔

تُو بکُلّ بینا نہ ای زانگہ تو بیراں ماندہ ای
تُو بکُلّ بینا شوی جان و جسد یکسان توست

ترجمہ: تُو کُلّ کو نہیں دیکھتا ہے اسی سبب سے تو گمراہ ہوا ہے، اگر تُو کُلّ کو دیکھے تو تیری روح اور جسم کی اہمیت یکسان ہوگی۔ یعنی روح اگر آج کثیف جسم میں ہے تو کل یہ لطیف جسم میں ہوگی اور اس کے بغیر روح کی کوئی زندگی نہیں۔

قرآنِ حکیم کے اس انقلابی راز میں اس طرح غور کیا جائے جیسا

کہ اس کا حق ہے: کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ نور عطا کیا جس کے اُجالے میں وہ لوگوں کے درمیان (فی الناس) چلتا رہتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکل سکتا ہو (۶/۱۲۲) یہاں عقلِ سلیم سے سوچنے کی سخت ضرورت ہے کہ اگر مذکورہ شخص کو ایک عام زندگی ملی ہے جو دوسروں کو ملتی ہے اور وہ لوگوں کے درمیان جسمانی طور پر اس طرح چلتا ہے جس طرح دوسرے لوگ چلتے ہیں، تو پھر یہاں زندگی اور نور کا اختصاص و احسان کیوں ہے اور دوسرے پر فوقیت کا ذکر کیوں ہونا چاہیئے، پس جان لیجئے کہ یہاں انسان کے اُس مرتبۂ اعلیٰ کا ذکر ہے، جس پر فائز ہو کر وہ لوگوں کے درمیان روحانیت میں چلتا ہے، جسمانیت کی بات ہی نہیں، یہ مرتبہ انسانِ کامل کو اب بھی حاصل ہے اور دوسرے سب کو اس کے حصول کے لئے فرمانبرداری کی ضرورت ہے۔

اس موضوع کے سلسلے میں یہاں تک جو حقائق بیان ہوئے ان کی روشنی میں اِس امر کی بہت بڑی اہمیت ظاہر ہو جاتی ہے کہ تصورِ آفرینش کے بارے میں ابھی بہت کچھ جاننا باقی ہے کیونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خالقِ برحق نے جن لوگوں کو پیدا کیا ہے، ان کی تخلیق مکمل ہو چکی ہے، حالانکہ حقیقت اس کے

برعکس ہے، وہ یہ کہ جسمانی تخلیق کے بعد روحانی تکمیل شروع ہو جاتی ہے، جس کی شرط خدا ورسولؐ اور ولیٔ امرؑ کی اطاعت ہے۔ وباللّٰہ التّوفیق۔

نصیرالدّین نصیرؔ ہونزائی۔
تحریر: ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۲ء
تحقیق: ۲۵ر اگست ۱۹۹۱ء

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

پیراہنِ یوسفؑ
یا معجزاتی کُرتا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ یا علی مدد ! میں آج بڑی مسرّت و شادمانی کے ساتھ پچھلی رات کے پُرسکوت و پُرسکون ماحول میں پاکیزہ مسگار کے ہمارے جانی عزیزوں کو ایک بہت ہی پسندیدہ علمی خط یا کہ مضمون تحریر کر رہا ہوں، یہ خصوصی مکتوب جو حُسنِ کارکردگی کے عوض میں انعام اور یادگار کے طور پر ہے اِن شاءاللہ تعالیٰ بنیادی حکمت کے سلسلے میں مفید اور مسرّت انگیز ثابت ہوگا، اور اس میں قریۂ مسگار کی مخلص جماعت کی ایمانی اور روحانی طاقتیں خداوندِ برحق کی مرضی سے میرے ساتھ ہوں گی، کیونکہ وہاں کی پاکیزہ روحیں آسمانی محبت کی نورانی بارش کے زیرِ اثر صاف و شفاف اور خدائے قدّوس کی پسندیدہ ہیں، خانۂ حکمت کے سلسلے میں ان عزیزوں

کی کافی خدمات اور قربانیاں ہیں، لہٰذا مجھے یقینِ کامل ہے کہ اس پُرخلوص خط سے جو کسی سپاسنامے سے کم نہیں، نہ صرف مسگار کے عزیزوں کو شادمانی ہوگی بلکہ اس سے پاکستان، لنڈن، فرانس، امریکا اور کینیڈا کے عزیزان بھی خوش ہوں گے اور اس کی کاپی کو مجلس میں پڑھنے کے بعد ریکارڈ میں رکھ لیں گے۔

یہ علمی اور عرفانی قصّہ بڑا عجیب و غریب اور بے حد دلپذیر ہے، اور اس میں ایک ایسے پیغمبرانہ معجزے سے بحث مقصود ہے کہ اس کی تہ تک جانے سے نہ صرف انبیاء و ائمّہ علیہم السّلام کی معرفت کا ایک اہم دروازہ کھل جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان آفاقی معجزات سے بھی آگہی ہوتی ہے جو آئندہ بڑے پیمانے پر اس دنیا میں رونما ہونے والے ہیں، اور یہ پُرحکمت قصّہ حضرت یوسف علیہ السّلام کے معجزانہ کرتے کا ہے، چنانچہ آپؑ نے اپنے والدِ محترم حضرت یعقوب علیہ السّلام کے لئے جو کُرتا مصر سے کنعان بھیج دیا تھا وہ کوئی ظاہری اور دنیاوی کپڑے کا نہ تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جثۂ ابداعیہ تھا، جو خداوندِ عالم کے ازلی و ابدی معجزات سے بھرپور اور "کُن فیکون" کے اوامر سے معمور ہے، یعنی وہ آسمانی لطیف جسم تھا جو قدرتِ خدا سے ہمہ رس اور ہمہ گیر ہے، مگر افسوس ہے

کہ بہت سے لوگ ایسے بھیدوں سے بے خبر ہیں۔

یہ بات یاد رہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے زمانے میں امامِ مُستَودع تھے، آپ کو اپنے والدِ بزرگوار حضرت یعقوب سے امامت غیر معمولی طور پر یعنی قبل از وقت مل گئی تھی، کیونکہ اس میں بھی ایک عظیم حکمت پوشیدہ ہے کہ کبھی کبھار نورِ امامت پہلے ہی منتقل ہو جاتا ہے۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی خوب یاد رہے کہ نورِ اقدس و اطہر کے کئی پہلو ہوتے ہیں، وہ اس طرح کہ ایک ہی نور ہے مگر اس کی بہت سی نسبتیں، یعنی یہ اگر ایک طرف سے خدا و رسولؐ اور علی کا نور ہے تو دوسری طرف سے زمانے کے امامؑ اور ان کے آباو اجداد کا ہے، چنانچہ نور کبھی بیٹا کہلاتا ہے اور کبھی باپ، امامؑ کی مبارک پیشانی میں نورِ ہدایت آباو اجداد کی حیثیت سے ماضی کے واقعات و حالات بھی بیان کر سکتا ہے اور آئندہ نسلِ امامت کی نمائندگی کرتے ہوئے مستقبل کے امور پر بھی روشنی ڈال سکتا ہے۔

برادرانِ یوسفؑ تاویلاً حدودِ دین ہیں، جو فلکی ذرّات میں کام کرتے ہیں، اور وہی حضرات امامِ عالیمقامؑ کی آسمانی قمیص لایا، لے جایا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں (یعنی حدودِ دین سے فرمایا کہ: یہ میرا کُرتا لے جاؤ

اور اس کو ابا جان کے چہرہ پر ڈال دینا کہ وہ پھر بینا ہو جائیں گے (۱۲/۹۳)۔

دُنیا کا کوئی کرتا ایسا معجزاتی نہیں ہو سکتا ہے کہ اس کی بدولت ایسی آنکھوں کی بینائی بحال ہو جائے، جن کی بصارت ضائع ہو چکی ہو، مگر یہ ہے کہ وہ کُرتا دستِ قدرت سے تیار ہوا ہو، اور اس میں "کُنْ فیکون" کا خدائی معجزہ کام کرتا ہو، ہاں صرف آسمانی کُرتا ہی ایسا ہے، کیونکہ وہ تمام معجزات کا سرچشمہ ہے اور اِس میں اور بھی تاویلی راز ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کی خوشبو قمیص کے پہنچنے سے بہت پہلے روانگی ہی پر محسوس ہونے لگی، اور جب آپؑ نے اس بات کو ظاہر کیا تو اِس پر آپ کے گھر والوں نے مذاق اڑایا، اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ مبارک خوشبو روحانی قسم کی تھی، اسی لئے یہ صرف یعقوبؑ ہی کو محسوس ہو رہی تھی، اور اگر واقعہ اس کے برعکس ہوتا تو اِس احساس میں سب برابر کے شریک اور یکسان ہوتے، اس سے معلوم ہوا کہ امام کا فلکی یعنی نوری جسم برحق ہے۔

اب ہم اس سے بھی زیادہ تاویلی نزاکتوں کی طرف آگے سے آگے بڑھتے ہیں، وہ یہ کہ امام صلوٰت اللہ علیہ بمرتبۂ انسانِ کامل ایک ایسی پاک شخصیّت اور ایک ایسی مکمل روح کا نام

ہے جس کو قرآنِ مقدّس نے نفسِ واحدہ (۶/۹۸، ۳۱/۲۸) کے اسم سے موسوم کیا ہے، اور یہ عظیم الشّان روح یا کہ نور اس لئے ہے تاکہ مومنین اس سے واصل ہو کر حقیقی معنوں میں زندہ ہو جائیں جیسا کہ زندہ ہو جانے کا حق ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ مومنین کو امامِ اقدس و اطہر کے مبارک نور میں فنا ہو جانا چاہئے، تاکہ امام کے جسمِ فلکی میں زندہ ہو جائیں، اور یہ فنا حقیقی فرمانبرداری اور سچّی محبّت میں پوشیدہ ہے۔

امامؑ کے فلکی جسم میں مومنین کے سمو جانے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جانے کے بارے میں یوں ارشاد ہے:۔

وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيلَ تَقِيكُم بَأْسَكُمْ كَذَٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ (۱۶/۸۱) اور اسی نے تمہارے لئے کُرتے بنائے جو تمہیں گرمی سے محفوظ رکھیں اور کُرتے جو تمہیں جنگ سے بچائیں اسی طرح خدا اپنی نعمت تم پر پوری کرتا ہے تاکہ تم سلامت رہو۔

یہاں آیۂ کریمہ سے مطلب واضح ہے کہ یہ خطاب مسلمین و مومنین سے فرمایا گیا ہے اور پروردگار کی یہ مخصوص نعمت بھی انہی کے لئے ہے، لیکن ظاہر میں ایسا کُرتا کہاں ہے جو ہم کو ہر قسم کی گرمی سے بچا سکے؟ اور اِس زمانے میں وہ کون سا کُرتا ہے جو ایٹمی جنگ کی زد سے کسی کو محفوظ رکھ سکتا ہو؟

کیا کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ اب قرآن کی ایسی باتیں (نعوذ باللہ) پُرانی ہو چکی ہیں؟ پس اِس بیان سے یہ تاویلی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ معجزانہ کُرتے اجسامِ لطیفہ ہی ہیں، جن پر نہ تو گرمی اثر انداز ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی ہتھیار، کیونکہ یہ تو قدرتِ خدا کے بنائے ہوئے معجزاتی کُرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص تاویلی حقیقتوں کو سننے کی سعادت چاہتا ہے تو اسے یہ اصول ماننا پڑے گا کہ قرآنِ حکیم نے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کی مثالوں میں بیان کیا ہے (۱۷/۸۹) چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السّلام کی سلطنتِ روحانیہ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ آپؑ کو ہوا مسخّر کی گئی تھی (۳۸/۳۶) یعنی جسمِ لطیف، جو ہوا کی طرح لطیف اور بسیط ہے، جس کو عام طور پر تختِ سلیمانؑ کہتے ہیں، اب یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آیا سلیمانؑ کا تخت صرف سلیمانؑ ہی کو نصیب ہوا تھا؟ نہیں تو اس سے عام مومنین کس طرح بہرہ ور ہو سکتے ہیں؟ اس کا جواب بھی خود قرآن ہی دیتا ہے کہ:-

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ط وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴/۳۴) اور جو کچھ تم نے مانگا سب میں سے تم کو عنایت کیا اور اگر خدا کی نعمتوں کو گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔ مطلب بالکل واضح ہے کہ مومنین اگر کامل

انسانوں کے نقشِ قدم پر چلتے گئے تو رحمتِ خداوندی ان کو توقع سے زیادہ نوازنے والی ہے اور ان کو اجسامِ لطیفہ کے تخت ملیں گے۔

آپ ذرا سوچ کے بتا دیجئے کہ تختِ سلیمانؑ اور تختِ بہشت (جو ہر مومن کو ملے گا) کے درمیان کیا فرق ہے؟ یا ان میں اعلیٰ کون سا ہے؟ جیسا کہ اس ارشاد میں فرمایا گیا ہے کہ: وہاں وہ تختوں پر تکئے لگائے (بیٹھے) ہوں گے نہ وہاں (آفتاب کی) دھوپ دیکھیں گے اور نہ شدّت کی سردی (۷۶/۱۳) آپ دیکھتے ہیں کہ اس تعلیم میں بھی وہی حقیقت جھلکتی ہے جو گرمی اور جنگ سے بچانے والے کرتوں میں پوشیدہ ہے (۱۶/۸۱) اب تختِ سلیمانؑ کی بات کریں کہ اگر مانا جائے کہ وہ جسمِ لطیف تھا جو زندہ اور عقل و علم کے جواہر سے آراستہ ہے تو پھر یہ وہی ابدی بہشت کا تخت ہوا، اور اگر نہیں تو دنیا کی چند روزہ تخت کی کیا وقعت ہو سکتی ہے، جبکہ آج کی دنیا والے بھی ہواؤں میں اُڑتے پھرتے ہیں، اب اس سلسلے میں ہم پھر قرآن میں دیکھتے ہیں اور اس باب میں خود حضرت سلیمانؑ کے قول کی ترجمانی ہوتی ہے کہ: (اور سلیمانؑ نے) کہا پروردگارا مجھے بخش دے اور مجھے وہ سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کی ملکیت نہ ہو یقیناً تو وَھّاب (دینے والا) ہے (۳۸/۳۵)

اس سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی نظر میں دنیاوی بادشاہی کی کوئی اہمیّت ہی نہ تھی، لہٰذا آپ ایک ایسی لازوال اور ابدی سلطنت چاہتے تھے جو روحانی طور پر آپ کی ذات ہی سے وابستہ ہو، وہ مادّی تخت و تاج کی طرح آپ کے بعد بطورِ ترکہ کسی اور کو نہ ملے اور اس دُعا کے آخر میں "وَھّاب" کا اسم لایا گیا، جس کی موجودگی کی صورت میں کسی کا یہ خیال ہرگز درست نہیں کہ حضرت سلیمانؑ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کسی اور کو بھی ایسی سلطنت نصیب ہو، پس یہ مفروضہ انبیائے کرام صلوات اللہ علیہم کے اخلاقِ حسنہ سے بہت دور ہے۔

یہاں یہ جاننا بہت ہی ضروری ہے کہ خدا کے دین میں دُنیاوی قسم کی بادشاہت کے لئے کوئی جگہ نہیں، اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت ہے، کیونکہ دین میں تو صرف خدا ہی کی ظاہری و باطنی حکومت ہے، آپ قرآنِ پاک میں اچھی طرح سے دیکھ سکتے ہیں کہ کسی بھی پیغمبر کے زمانے میں کوئی ایسا بادشاہ نہیں ملتا جو نبوّت یا امامت کے بغیر دینی قانون کا مالک ہو سکے، کیونکہ دنیا میں ہمیشہ سے خلافتِ الٰھیّہ اور آسمانی بادشاہی چلتی آئی ہے، جیسا کہ آلِ ابراہیمؑ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ :۔

ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی ہے اور ان کو بہت بڑی سلطنت بھی دی ہے (۴/۵۴) چنانچہ اِس روحانی سلطنت کی ایک اور مثال حضرت طالوت علیہ السّلام سے بھی مل سکتی ہے کہ آپ حضرت داؤدؑ سے پہلے امام تھے، آپ کے روحانی علم اور فلکی جسم کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے اور وہ یہ ہے:-

قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ط وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (۲/۲۴۷) نبی نے کہا خدا نے اسے تم پر برگزیدہ کیا ہے اور علم و جسم کا پھیلاؤ بڑھا دیا ہے اور خدا اپنا ملک جسے چاہے عطا کر دیتا ہے اور خدا سب سے وسیع علم رکھتا ہے۔

اس آیۂ کریمہ میں انتہائی خوبصورتی سے مرتبۂ امامت کی اُن دو عظیم الشّان چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے صرف انبیاء و ائمہ علیہم السّلام کو عطا ہوتی ہیں، وہ روحانی علم اور فلکی جسم (آسٹرل باڈی) ہیں، چنانچہ اس آیت میں آپ دیکھتے ہیں کہ پہلے علم کا ذکر ہے پھر جسم کا، اور دونوں کو پھیلاؤ میں بڑھانے کا تذکرہ ہے، دانشمند جانتا ہے کہ اس میں عام جسم کی بات ہی نہیں، یہ تعریف لطیف جسم سے متعلق ہے۔

ISW Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science

اِن شاء اللہ تعالیٰ آئندہ کسی وقت یو۔ایف۔او (U.F.O.) کا بھی کچھ بیان کر دیں گے، کیونکہ یہ آج کل کا اہم ترین مسئلہ ہے۔

امامِ زمان کا ایک ادنیٰ غلام
نصیرُ الدّین نصیرؔ ہونزائی
تحریر: ۱۲ر جنوری ۱۹۸۱ء
تحقیق: ۲۱ر اگست ۱۹۹۱ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

روحانیت کے مشورے

۱۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ روحانی ترقی کے لئے سب سے پہلی چیز اخلاق ہیں، پھر عقیدہ، بندگی اور علم یقین۔

۲۔ تقویٰ کی صفت اخلاق اور دینداری کے تمام نتائج و ثمرات کا جوہر ہے، لہٰذا تقویٰ بندۂ مومن کو اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے۔

۳۔ تقویٰ میں خوفِ خدا ایک غالب عنصر بھی ہے، مگر خوفِ خدا کس طرح سے ہو سکتا ہے، وہ سمجھنے کی بات ہے کیونکہ اُس خوف کا تصور علم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

۴۔ اس دُنیا میں اگر مولا کے پیارے بندوں کی ہمنشینی میسّر ہو تو وہ بڑی غنیمت ہے، کیونکہ وہ نیکی کی طرف ایک عملی ہدایت ہے۔

۵۔ آپ کا علمی مرتبہ جو کچھ بھی ہو، ہر حالت میں دوسروں کو کچھ علم دینا چاہیئے، کیونکہ اس سے قدرتی طور پر علم میں تحریک پیدا ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ آپ اپنے دل سے علم کی جو مقدار نکال کر دیں گے، اس کی جگہ لینے کے لئے خدائی علم آئے گا، جب کہ اس کام کے ساتھ ساتھ تقویٰ بھی ہو۔

۶۔ علم دو طریقوں سے دیا جائے، ایک عام مجلس یا اجتماع میں اور ایک خاص حلقۂ احباب میں، تاکہ ہر کسی کو اس کی سمجھ بوجھ کے مطابق سمجھانے کا موقع فراہم ہو، ساتھ ہی ساتھ آپ کے علمِ عام اور علمِ خاص میں برکت پیدا ہو۔

۷۔ عبادت کے لئے سب سے اچھی جگہ جماعت خانہ ہے، کیونکہ وہ ثواب اور امن کی جگہ ہے جیسا کہ قرآنِ مجید میں مذکور ہے (۲/۱۲۵) اس کے علاوہ جماعت خانہ سے باہر بھی عبادت کریں، تنہا بھی اور دوستوں کے ساتھ بھی۔

۸۔ جماعتی خدمت سے روحانی ترقی میں مدد ملتی ہے، اور خدمت جتنی دور رس ہو اتنا اس کا ثواب ملے گا، اس سلسلے میں علمی خدمت سب سے زیادہ مفید ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ حال اور مستقبل میں تمام دنیائے اسماعیلیت کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔

۹۔ نیّت، قول اور عمل یہ تین چیزیں ہیں، جن کے ذریعے

سے مومن روحانی ترقی کر سکتا ہے، لہٰذا ان تینوں کو انتہائی پاک و پاکیزہ رکھنا چاہیئے۔

۱۰۔ اگر کسی کے اعمال پاک نہیں ہوتے تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی زبان پاک نہیں ہے اور اگر زبان پاک نہیں تو جاننا چاہیے کہ دل یعنی نیت پاک نہیں، اسی لئے پیغمبرِ برحقؐ نے ارشاد فرمایا کہ: اعمال کا دارومدار نیّات پر ہوتا ہے۔

۱۱۔ ذکر و عبادت میں انقلابی ترقی ہو سکتی ہے اور رفتہ رفتہ ترقی بھی، نیز کچھ اِس میں سے اور کچھ اُس میں سے بھی ہو سکتی ہے۔

۱۲۔ روحانی ترقی تواضع، حلم اور انکساری کے بغیر ناممکن ہے، تکبّر سے انسان گر جاتا ہے۔

۱۳۔ ذکرِ الٰہی کسی ایک اسم سے بھی ہو سکتا ہے یا کسی ایک تسبیح کے ذریعے بھی کیا جا سکتا ہے، اور مختلف اسماء سے بھی، آپ کو اگر کسی ایک اسم سے بہت لذّت محسوس ہوتی ہے تو اس کو پڑھتے رہیں، اگر مختلف اذکار سے خوشی ہوتی ہے تو انہیں سے فائدہ اٹھائیں، یہ بات خصوصی ذکر کے علاوہ عبادت کے لئے ہے۔

۱۴۔ ذکر و عبادت کے اشغال مختلف ہوا کرتے ہیں، چنانچہ ایک شغل پروردگارِ عالم کی نعمتوں کی شکر گزاری ہے، ایک شغل

گناہوں سے توبہ ہے، ایک شغل دیدارِ الٰہی کے لئے رونا ہے، ایک شغل ایسی دعاؤں پر مبنی ہے جن میں اپنے لئے اور تمام مومنین کے لئے بھلائی اور بہتری مانگی جاتی ہے۔

۱۵۔ تنہائی میں اور آزاد عبادت میں جب بھی سجدہ کیا جائے تو وہ انتہائی ادب اور عاجزی سے ہو اور اس میں کچھ دیر زمین سے پیشانی نہ اٹھائی جائے، کیونکہ خداوند نے فرمایا ہے: وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (سجدہ کر اور نزدیک ہو جا) اور سجدہ میں دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

۱۶: ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگنے کی عادت ہونی چاہیے، تاکہ دل کی کیفیت خدا کے حضور میں ہمیشہ محتاج رہے، تاکہ جس سے خدا کی رحمت شاملِ احوال ہو۔

۱۷۔ شیطان خواہشاتِ نفس کے وسیلے کے بغیر نہیں آ سکتا، نفس ہی شیطان کا گدھا ہے، جس پر سوار ہو کر اپنا کام پورا کرتا ہے، اگر انسان اپنے نفس کا مخالف رہا تو شیطان قریب بھی نہیں آسکتا۔

۱۸۔ حقیقی مومن کو یہ حکمت سمجھنا چاہئے کہ جو لوگ امام سے دور ہیں، ان سے دور رہنا ہے اور جو امامِ زمان کے قریب ہیں ان کے قریب رہنا ہے۔

۱۹۔ لذتیں دو قسموں میں ہیں، روحانی اور جسمانی۔ چنانچہ

جب تک حرام جسمانی لذتوں کے تصور کو ترک اور حلال کو کم نہ کیا جائے تو روحانی لذتیں ہرگز حاصل نہیں ہوتیں۔

۲۰۔ روحانی ترقی جب بھی رُک جائے تو وہ گناہوں کے سبب سے ہے، خواہ وہ گناہ ایک ہو اور بہت بڑا ہو یا بہت سے چھوٹے چھوٹے گناہوں کا مجموعہ ہو۔

۲۱۔ ایک مومن کہتا تھا کہ میری روحانی ترقی نہیں ہو رہی ہے، حالانکہ میں عبادت میں باقاعدگی رکھتا ہوں، وسوسہ وغیرہ بھی ٹھیک سے ادا کرتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ گناہ نہیں کرتا ہوں۔ میں نے کہا ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کا کوئی بھی گناہ نہ ہونے کے باوجود روحانی ترقی نہ ہو، بہت ممکن ہے بلکہ یقینی بات ہے کہ آپ کا گناہ ہے جس کی وجہ سے ترقی نہیں ہوتی ہے۔

۲۲۔ گناہ کئی طرح سے ہوتا ہے، جانتے بوجھتے ہوتا ہے، لاعلمی اور نادانی سے ہوتا ہے، ظاہر میں ہوتا ہے، باطن میں ہوتا ہے، بُرا سمجھتے ہوئے ہوتا ہے، غرضیکہ گناہ جس نوعیت کا بھی ہو، گناہ ہی ہے، وہ اپنا اثر دکھاتا ہے، روحانی ترقی سے روکتا ہے، بلکہ اکثر دفعہ ابدی عذاب میں گرفتار کر ڈالتا ہے۔

۲۳۔ یہ معلوم کر لینے کے لئے کہ دل میں تقویٰ ہے یا

گناہ، مومن کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس سے ہر قسم کے دینی فرائض ادا ہوتے ہیں یا نہیں؟ ذکر و عبادت آگے بڑھتی رہتی ہے یا مزہ نہیں آرہا ہے؟ دینی علم کا شوق بڑھ رہا ہے یا ملالت ہو رہی ہے؟ کیا دل میں عشقِ مولا آگیا ہے؟ اگر اس قسم کی نیکی کی علامتیں نہیں ہیں یا کمزور ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ گناہ ہے۔

۲۴۔ گناہ درختِ ملعون ہے، اس کی شاخ بدی سے وہ اور بڑھ جائے گا، اس لئے اس کی جڑوں کو کاٹنا چاہیئے، تاکہ وہ سُوکھ کر ختم ہو جائے۔

لفظی توبہ سے کچھ نہیں بنے گا، جب تک کہ عملاً توبہ نہ کرلی جائے، اور عملی توبہ مشکل ہے جب کہ اس عمل کا علم نہ ہو یعنی ترکِ گناہ اور توبہ کا مطلب سمجھ لینا ضروری ہے۔

۲۵۔ عبادت خدا تعالیٰ کی غلامی کا نام ہے اور غلامی میں آقا اور مالک کی ساری خدمتیں مطلوب ہیں، اور اس میں سب سے اعلیٰ خدمت وہ ہوگی جو آقا کی مرضی کے مطابق ہو اور جس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

۲۶۔ علم طہارت یعنی پاکیزگی بھی ہے، علم عبادت بھی ہے، علم زکات بھی ہے، علم روزہ بھی ہے، علم حج بھی ہے، علم جہاد بھی ہے اور علم ولایت بھی ہے، کیونکہ علم سب

کچھ ہے۔

۲۷۔ اگر آپ علم دے سکتے ہیں یا علم دینے میں مدد کر سکتے ہیں، تو گویا کسی نابینا کو آنکھ دیتے ہیں یا کسی بہرے کو کان عطا کرتے ہیں، کسی گونگے کو زبان عنایت کرتے ہیں، کسی لُولے کو ہاتھ بخشتے ہیں، کسی لنگڑے کو پاؤں دیتے ہیں اور کسی مُردے میں روح پھونکتے ہیں، ننگے کو لباس مہیّا کر دیتے ہیں، بھوکے کے لئے خوراک کا انتظام کر دیتے ہیں، مفلس کو خزانہ دیتے ہیں، گِدا کو بادشاہ بناتے ہیں اور جاہل کو عاقل بنا دیتے ہیں۔

۲۸۔ حقیقی مومن نیت کرے کہ وہ راہِ مولا میں اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتے ہوئے چالیس مرتبہ سخت غصّہ کو پی لے گا، چالیس دفعہ نفس کی خواہشات کو ٹھکرائے گا، چالیس ایسے مومنوں کے حق میں نیک دعائیں مانگے گا، جن کے متعلق اس کا گمان ہو کہ وہ اچھے نہیں ہیں، چالیس اچھی عادتوں کو اپنائے اور چالیس دن کثرت سے خدا کو یاد کرے۔

۲۹۔ مومن یہ کوشش کرے کہ وہ ہر روز نیکی کمائے، نیک کاموں میں وقت گزارے، روزانہ کچھ علم حاصل کرے، دینی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھے، نیک لوگوں سے ملے اور عبادت سے خوشی حاصل کرے۔

۳۰۔ روحانی ترقی شروع ہونے کی علامتیں یہ ہیں کہ ذکر و عبادت سے سخت عشق پیدا ہو جاتا ہے، وقت پر بلکہ پیشگی طور پر جاگا جاتا ہے، دل میں بہت ہی نرمی اور بار بار گریہ و زاری ہوتی ہے، ذکر کا خوب سلسلہ بنتا ہے اور بہت زیادہ سنجیدگی اور اندر ہی اندر سکون پیدا ہوتا ہے۔

۳۱۔ کچھ وقت کے بعد دل کی روشنی پیدا ہوتی ہے اور اس روشنی میں بے حد خوشی ہے گو کہ یہ ابتدائی قسم کی روشنی ہے جو مادّی روشنی سے مشابہ ہے مگر اس سے نہایت ہی خوش رنگ ہے اور رفتہ رفتہ انتہائی تیز ہو جاتی ہے۔

۳۲۔ اس مقام پر اگرچہ یہ روشنی روحانی اور عقلی نہیں بلکہ یہ طبعی ہے، تاہم اس سے مومن کے دل میں بے حد خوشی پیدا ہوتی ہے، شاید اس لئے کہ اس منزل میں اس کی باطنی آنکھ کھل جاتی ہے اور اپنی ہستی کی شناخت کا آغاز ہو جاتا ہے۔

۳۳۔ جس طرح عالمِ ظاہر میں مادّی، فنّی اور علمی روشنی ہے، یعنی سورج وغیرہ کی روشنی، ہُنر کی روشنی اور علم کی روشنی، اسی طرح عالمِ باطن میں طبیعت کی روشنی ہے، بعد ازاں روح کی روشنی اور عقل کی روشنی ہے، یا طبیعت کو جسمِ لطیف کہنا چاہئے۔

۳۴۔ جسمِ لطیف کو ماننا چاہئے کیونکہ جسمِ لطیف موجود ہے وہ فلکی جسم ہے، جثۂ ابداعیہ ہے، وہ نورانی جسم ہے۔

۳۵۔ جسمِ لطیف آسٹرل باڈی (ASTRAL BODY) یا اثیر (ETHER) کا جسم ہے جس کو اثیری جسم کہنا چاہئے۔

۳۶۔ عالمِ باطن سے کون انکار کر سکتا ہے، اس میں سب کچھ ہے مگر لطیف شکل میں، کُلُّ شَئٍ لطیفۃ مُوْدَعَۃ فی ھٰذِہِ المجموعہ (ہر لطیف شئ اس مجموعہ میں یعنی قالبِ انسانی میں ودیعت کی گئی ہے)۔

فقط دعاگو

نصیرالدین نصیرؔ ہونزائی

لنڈن

۲۷؍ اگست ۱۹۹۱ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

سب سے عظیم تاویلی راز

عرشِ اعلیٰ

۱۔ عرش کے ابتدائی لغوی معنی بلند جگہ ہیں اور اسی معنیٰ میں عرش کا مطلب تخت ہوا، جس میں بادشاہ اور بادشاہی کا تصوّر موجود ہے، چنانچہ اصطلاحِ دین میں عرش اللہ تبارک وتعالیٰ کے تختِ بادشاہی کو کہتے ہیں، چونکہ عرش بموجبِ ارشاداتِ قرآن نہ صرف ظاہری طور پر بنیادی اہمیّت کا حامل ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ سب سے عظیم تاویلی راز بھی ہے، لہٰذا لازمی ہے کہ امامِ برحق صلوات اللہ علیہ کی دستگیری اور یاری سے عرشِ اعلیٰ کی چند حکمتیں بیان کی جائیں۔

۲۔ قرآنِ پاک میں آسمان وزمین کی تخلیق کا تذکرہ ظاہر ہے، لیکن عرش کو وجود میں لانے کا براہِ راست کوئی ذکر نہیں، بلکہ فرمایا گیا ہے کہ خدا کا تخت پانی پر تھا (۱۱) اس کے یہ معنی ہوئے

کہ عرشِ الٰہی ہمیشہ سے موجود ہے، کیونکہ وہ عالمِ امر ہے، اس لئے وہ قدیم اور تخلیق سے بالاتر ہے۔

۳۔ حکمائے دین کے نزدیک عرشِ خداوندی مادّی قسم کا کوئی تخت ہرگز نہیں، بلکہ یہ لفظ ایک مثال ہے اور اس کا ممثول ایک عظیم فرشتہ ہے، جس کو خداوند تعالیٰ نے تمام عقول کا سرچشمہ بنایا ہے، اس لئے اس کو عقلِ کُلّ کہا جاتا ہے، پس یہی سب سے عظیم فرشتہ عرشِ الٰہی بھی ہے اور قلمِ قدرت بھی۔

۴۔ ہر دانشمند اس حقیقت کو قبول کر لیتا ہے کہ اللہ کا تخت نہ صرف پہلے ہی پانی پر قائم تھا، بلکہ یہ اب بھی اسی طرح ہے، کیونکہ پانی سے علم مراد ہے اور عرش کا مطلب عقلِ کُلّ ہے، سو فرشتۂ عقلِ کلّی کا قیام ہمیشہ کے لئے علم ہی پر ہے، یہ ہُوا خداوندِ عالم کے عرش کا پانی پر ہونا۔

۵۔ عرشِ اعلیٰ جو ایک عظیم فرشتہ ہے، اس کا روحانی مشاہدہ انسانی صورت میں ہوتا ہے، کیونکہ فرشتہ خود انسان کی ترقی یافتہ صورت ہے، اور انسان وہ ہے جس کو رحمانی شکل و شمائل پر پیدا کیا گیا ہے۔

۶۔ اسلام میں جس طرح عرش کی عظمت و رفعت بیان کی گئی ہے، وہ جسمانی اور مکانی اعتبار سے نہیں، بلکہ روحانی

اور شرفی لحاظ سے ہے، یعنی عرشِ عظیم اور عرشِ اعلیٰ کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ جسامت اور ضخامت میں کائنات کی وسعتوں پر محیط اور حاوی ہے، بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ نورانیت اور روحانیت میں ہر چیز سے عظیم و اعلیٰ ہے۔

۷۔ یہ جو حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ بندۂ مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کا عرش ہے، اس کا مطلب بھی وہ عرفانی تصور ہے جو صرف حقیقی مومن کے دل و دماغ میں قائم اور روشن ہو جاتا ہے، جو ایمان و ایقان کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔

۸۔ عرش روح میں ہے جسم میں نہیں، لیکن روح اور جسم کے درمیان جو رشتہ اور رابطہ ہے، اس کے اعتبار سے جسم میں بھی کوئی ایسا مقام ہونا چاہیئے، جو عرش کی مثال اور مقابل ہو، یا اس کا مظہر کہلائے، ہاں ایسا مقام ہے اور وہ پیشانی ہے۔

۹۔ انفرادی اور ذاتی روحانیت کے عالم میں پیشانی وہ جگہ ہے جہاں اہلِ بصیرت کے سامنے ایسے بہت سے واقعات آتے ہیں، جن کا تعلق قصۂ قرآن میں عرشِ عظیم سے ہے۔

۱۰۔ یہ حقیقت ہے کہ کائنات پر کرسی محیط ہے، جو نفسِ کلی ہے، اور کرسی پر عرش محیط ہے، جو عقلِ کلی ہے، مگر یہ احاطہ روحانی اور عقلی ہے، نہ کہ ظاہری اور مادی، جس کی مثال ہم انسانی جسم سے لے سکتے ہیں، کہ جسم پر روح کا کنٹرول

ہے بغیر کسی مادّی احاطہ کے، اور اسی طرح روح پر عقل محیط ہے بغیر کسی ظاہری حصار کے۔

۱۱۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت ہے کہ اُس نے ظاہری کائنات، عالمِ دین اور عالمِ شخصی کو ایک دوسرے کے مشابہ بنایا ہے، تاکہ اس کے مخلص بندوں پر حقیقت کے اسرار پوشیدہ نہ رہیں، اور اہلِ بصیرت اپنی ذات ہی میں آیاتِ قدرت و حکمت کا مشاہدہ اور مطالعہ کر سکیں۔

۱۲۔ قرآن (۲۷/۴۰) میں ہے کہ ملکۂ بلقیس کے مطیع ہو کر آنے سے قبل اُس کا تخت جو عربی میں عرش ہے سلیمانؑ کے حضور میں لایا گیا تھا، اس کی تاویل اس ملکہ کی روحانی تصویر ہے، جس پر بلقیس کی "انا" قائم تھی، اس مثال سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ عرشِ عظیم انسانِ کامل کا روحانی عکس ہے، جو معرفتِ خدا اور تصوّرِ توحید کا حامل ہے۔

۱۳۔ قرآن (۲۷/۲۶) میں جو "ربّ العرش العظیم" فرمایا گیا ہے، اس کے معنی ہیں کہ اللہ عرشِ عظیم کا مالک و پروردگار ہے اور اس کا اشارہ یہ بھی ہے کہ خدا ان فرشتوں اور روحوں کا پروردگار ہے جو عرش کے نزدیک ہیں، یعنی عرش سب سے اعلیٰ درجے کی روحانی تربیت گاہ ہے۔

۱۴۔ آیت کا یہ حصہ: "ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ" (۷/۵۴)

تاویل طلب ہے، جس کی تاویل کئی طرح سے ہے، اور اس کی ایک بہت بڑی انقلابی تاویل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آسمان و زمین کی مخلوقات میں مختلف درجات مقرر کر دئیے، مگر عرش تک جو چیزیں پہنچتی ہیں، ان میں اتحاد و یک رنگی پیدا کر کے اپنی رحمانیت کے مساوات کا ثبوت دیا۔

۱۵۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے: اور ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں (۳۹/۶۷) اس کے یہ معنی ہیں کہ زمین و آسمان کی سب چیزیں خدا کے داہنے ہاتھ میں ایک ہوں گی، اور اللہ تعالیٰ کا یہ فعل عرش پر وقوع میں آئے گا، کیونکہ اس وقت ارض و سما کا وجود خدا کے قبضۂ قدرت میں ایک موتی کے برابر ہوگا۔ یہ ہوئی تاویل "استوی علی العرش" کی۔

۱۶۔ سورۂ حج آیت ۱۰۴ میں بھی یہی مفہوم ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے ساری کائنات کو لپیٹ کر ایک ایسا گوہر بنا لے گا، جیسا کہ یہ خلقتِ عالم و آدم سے پہلے تھا، جس سے کائنات پیدا کی گئی، تاکہ دیدۂ دل رکھنے والے اپنے عرفانی مشاہدے سے یہ سمجھ سکیں کہ ازل میں بھی اور ابد میں بھی تمام حقیقتوں کی ایک ہی حقیقت ہے، جس کو مونو ریالزم یعنی یک حقیقت کہا جاتا ہے۔

۱۷۔ جس آدمی کو عرش کی شناخت نہ ہو اس کو خدا کی شناخت

نہیں، کیونکہ خدا حقیقی بادشاہ ہے اور عرش اس کا تخت، نیز اس لئے بھی کہ عرشِ الٰہی نورِ معرفت کی حیثیت سے ہے، جس سے تمام اعلیٰ درجے کے حقائق و معارف وابستہ ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کئی دفعہ عرش کا حوالہ دیا گیا ہے جبکہ خداشناسی کے بارے میں لوگوں کے غلط تصوّر کا ذکر ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:-

آسمان اور زمین کا مالک جو کہ عرش کا بھی مالک ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ (کافر) لوگ بیان کرتے ہیں (۴۳/۸۲) یعنی خداشناسی کے لئے صرف آسمان و زمین کی آیات میں غور کرنا کافی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر عرش کی پہچان زیادہ ضروری ہے۔

۱۸۔ جب بندۂ مومن کا دل علم و عمل سے جیسا کہ چاہئے خدا کا عرش بن جاتا ہے، تب ایسا بندہ عرش کے بالکل قریب ہو جاتا ہے اور وہ اُس حالت میں عرش کے اسرار سے واقف و آگاہ ہو جاتا ہے اور مساواتِ رحمانی کے بھیدوں کو سمجھتا ہے۔

۱۹۔ اہلِ معرفت کا دل و دماغ حقیقی علم کا پانی ہے، جس پر عرشِ خداوندی کا روشن تصوّر قائم ہو جاتا ہے، اسی طرح وہ عرش کو روحانی طور پر دیکھ سکتے ہیں اور اس کی حکمتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔

۲۰۔ عرشِ عظیم کے اٹھانے والے فرشتوں سے ائمہ مطاہرین

علیہم السّلام مراد ہیں، چونکہ عرش نور ہے اور اس کے حامل پاک امام ہیں، نور اور عظیم روح ایک ہے، اور پاک ائمہ روحانیت و جسمانیت دونوں میں عظیم فرشتے ہیں۔

۲۱۔ سورۂ یوسف (۱۲/۱۰۰) میں ہے کہ: وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهٗ سُجَّدًا۔ اور (یوسف نے) اپنے والدین کو تخت پر رفعت دی اور وہ سب یوسف کے آگے سجدے میں گر گئے۔ یعنی یوسف نے اطاعت کر کر کے اپنے روحانی والدین (امام اور باب) کو روحانیت میں تختِ پیشانی پر بٹھا دیا، پھر وقت آنے پر امام، باب اور گیارہ حجتوں نے یوسف کی اطاعت کی، یعنی یوسف خود امام بن گیا، پس یہاں یہ اشارہ ہے کہ پیشانی شخصی عالم کا عرش ہے۔

۲۲۔ قرآنِ پاک (۲/۲۱۳) میں ہے کہ لوگ شروع میں ایک ہی اُمّت تھے، یعنی یہ ازل کی بات ہے اور اسی طرح وہ ابد میں بھی ایک ہوں گے، کیونکہ جو چیز ازل میں جیسی تھی، وہ ابد میں بھی جا کر ویسی ہو گی، یہ عرش پر خدا کے استوی کرنے کے معنی ہیں۔

۲۳۔ آیۂ کریمہ کا ترجمہ ہے کہ: آپ فرمائیے کہ اگر خدا کے ساتھ اور بھی معبود ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو اس

حالت میں عرش والے تک انھوں نے رستہ ڈھونڈ لیا ہوتا (۱۷/۴۲) اس کا مطلب یہ ہوا کہ عرش ازل و ابد میں وہ مقام ہے جہاں پر سب کو لازماً ایک ہو جانا ہے۔

۲۴۔ قرآنِ مقدس اور علمی روحانیت کا اصول یہ ہے کہ کشفِ باطن اور روحانی مخاطبہ تین مقامات سے ہوتا ہے، مقربین کے لئے سامنے (یعنی پیشانی) سے، اصحابِ یمین کے لئے دائیں کان سے، اور اصحابِ شمال کے لئے بائیں کان سے، اور قیامت کے دن بندوں کو تین درجوں میں جو اعمالنامہ ملنے والا ہے، وہ بھی یہی ہے، چونکہ روحانیت خود قیامت ہے، پس روحانیت کا سب سے اعلیٰ دروازہ سامنے سے کھلتا ہے، دوسرا اور تیسرا درجہ دائیں اور بائیں کان ہیں، اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ پیشانی عرشِ عظیم کی مثال ہے۔

۲۵۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج آپؐ کی مبارک پیشانی میں ہوئی تھی، اس لئے کہ ذاتی روحانیت میں پیشانی عرش کی مظہر ہے، اور آنحضرتؐ کو ایسی کئی معراجیں ہوئی تھیں، مگر نمایاں ذکر اسی معراج کا ہے جو پہلی بار حضورِ انورؐ کے سامنے آئی تھی، پس یاد رہے کہ پیشانی کے مقام پر روحانیت کے جو عجائب و غرائب وقوع پذیر ہوتے ہیں، ان میں عرشِ الٰہی کے عظیم اسرار پوشیدہ ہیں۔

فقط عزیزوں کا علمی خادم

نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی

حیدر آباد۔ ہونزا

گلگت

تحریر: ۲۱ر اگست ۱۹۸۰ء

تحقیق: ۲۸ر اگست ۱۹۹۱ء

ISW LS
Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

ضمیمہ

فرشتہ، پری اور دیو کے بارے میں

فرشتہ و پری و دیو را بدانستم که ہست و نیز بباید بہست بر، تکرار
زما و کیف بگوی و برسم برہان گوی گر آمدہ است بِردن این سخنت از اسنار

۱۔ یہ شخص کہتا ہے کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ فرشتہ، پری اور دیو موجود ہیں لیکن یہ بے دلیل اقرار کافی نہیں۔ اس لئے بتائیے کہ ان میں سے ہر ایک کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ جیسا کہ کہا: "زما و کیف بگوی، و برسم برہان گوی"۔ یعنی ان کی ماہیت و کیفیت کے بارے میں ازروئے قانونِ استدلال بتائیے۔ (اب فرشتہ، پری اور دیو کی ماہیت و کیفیت بتانے سے پہلے یہ جاننا

ضروری ہے) کہ ماہیت کسی چیز کے "کیا ہونے" کو کہتے ہیں، جو تلاش ہے اس کی جنس کے بارے میں۔ اور کیفیت اس چیز کے "کیسے ہونے" کو، جس سے مراد اس کی شکل اور رنگ ہے اگر وہ چیز جسم ہے، اگر جسم نہیں تو اس کے فعل کی صفات ... مثلاً کوئی پوچھے کہ "درخت کیا ہے؟" تو یہ درخت کی جنس کے بارے میں اس کی تلاش ہے۔ اس کے جواب میں اگر کوئی نباتات (اُگی ہوئی چیز) سامنے ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ: درخت اس کی جنس میں سے ہے۔ اگر سامنے کوئی نباتات نہ ہو تو کہا جاتا ہے کہ: درخت ایک بڑھنے والا اور مٹی اور پانی کو ایک دوسری صورت میں بدلنے والا جسم ہے۔ اور جو پوچھے کہ "درخت کیسا ہوتا ہے؟" تو اس کو جواب دیا جاتا ہے کہ: اس کا ایک سرا زمین میں گاڑا ہوا ہوتا ہے، اور دوسرا سرا بہت سی شاخوں اور پتوں کے ساتھ ہوا میں بلند ہوتا ہے۔ یہ ہیں معنی "ماوکیف" یعنی ماہیت و کیفیت کہ اس شخص نے ان ابیات میں پوچھا ہے۔

۲۔ اگر کوئی فرشتہ کے بارے میں پوچھے کہ "کیا ہے؟" تو اس کے لئے جواب بقول (فلاسفر) کے یہ ہے کہ فرشتے کواکب آسمان کے یہ اجرام ہیں جو زندہ و سخنگو ہیں اور خدا کے حکم سے عالم میں کام کرنے والے ہیں۔ ثابت بن قرۃ الحرانی، جس نے یونانی

زبان اور رسم الخط سے عربی زبان اور رسم الخط میں فلسفہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اس قول کے ثبوت میں کہ افلاک و کواکب زندہ و سخنگو ہیں، دلیل دیتے ہوئے کہا ہے کہ "انسان کو زندگی اور سخنگوئی اس بنیاد پر حاصل ہے کہ اس کا بدن ایک بہت ہی شریف بدن ہے اور ایک بہت ہی شریف بدن میں جو انسانی بدن ہے ایک بہت ہی شریف روح اُتر آئی ہے اور وہ زندہ و سخنگو روح ہے" یہ ایک مقدمۂ صادقہ ہے۔ پھر کہا ہے "اور افلاک و انجم کے اجرام نہایت ہی شریف اور لطیف ہیں اور نہایت پاکیزہ ہیں" یہ دوسرا مقدمۂ صادقہ ہے۔ ان دو مقدمات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ افلاک و انجم کی ایک نہایت ہی شریف روح ہے۔ چونکہ وہ روح جو نہایت ہی شریف ہے نفسِ ناطقہ ہے اس لئے افلاک اور انجم بھی نفسِ ناطقہ رکھتے ہیں اور یہ زندہ و سخنگو ہیں۔ یہ ایک دلیل ہے جو اس فیلسوف نے اس قول کے ثبوت میں کہ فرشتے افلاک و کواکب ہیں اور سخنگو ہیں، پیش کی ہے۔

۳۔ فلاسفر پری کو نہیں پہچانتے ہیں لیکن وہ دیو کے ہونے کا اقرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: بدکردار جاہلوں کی وہ روحیں جو بدن سے جدا ہوتی ہیں اسی عالم میں رہ جاتی ہیں، چونکہ یہ حسی خواہشوں کے ساتھ بدن سے نکل جاتی ہیں اور وہ خواہشات

ان کو کھینچتی ہیں اس لئے وہ طبائع سے گزر نہیں سکتی ہیں۔ اور (ایسی روح) ایک بدصورت بدن میں داخل ہو جاتی ہے اور دنیا میں گردش کر رہی ہے اور لوگوں کو دھوکہ دیتی اور بدکرداری سکھاتی ہے اور بیابانوں میں لوگوں کو گمراہ کر دیتی ہے تاکہ وہ ہلاک ہو جائیں، جیسا کہ محمد زکریا رازی نے "کتاب (علم) الٰہی" میں کہا ہے کہ "بدکرداروں کی روحیں جو دیو بن جاتی ہیں، خود کو ایک صورت میں لوگوں کو دکھاتی ہیں اور ان سے کہتی ہیں کہ جاؤ! لوگوں سے کہہ دو کہ میری طرف ایک فرشتہ آیا ہے اور کہا ہے کہ خدا نے تجھے پیغمبری دی ہے اور میں وہ فرشتہ ہوں! تاکہ اس سبب سے لوگوں کے درمیان اختلاف پڑ جائے اور اس روح کی تدبیر سے جو دیو بن گئی ہے بہت سے لوگ قتل ہو جائیں"۔ ہم نے "بستان العقول" میں اس بیباک خبطی کے قول کی تردید میں بحث کی ہے۔ اس لئے اب پھر یہاں اس خبط کے جواب دینے میں مصروف نہیں ہو جائیں گے تاکہ ہم اپنے مقصد سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ یہ ہے فلسفیوں کا قول فرشتہ اور دیو کے بارے میں۔

۴۔ لیکن اہلِ تائید کا جواب جو اس سوال (یعنی فرشتہ کیا ہے؟) کا ہے ہم کتابِ خدا اور شریعتِ رسول علیہ السلام و علی وارث مقامہ، کے علم کے خازن کی اجازت سے بیان کرتے ہیں کہ: فرشتہ

ایک مجرّد (یعنی مادّہ سے خالی) روح ہے، جو باری سبحانہ سے ابداع کے ذریعے وجود میں آیا ہے: جیسے عقل، نفس، جدّ، فتح اور خیال، جن کے نام کتاب و شریعت کے ظاہر میں قلم، لوح، اسرافیل، میکائیل اور جبرئیل ہیں۔ اور ابداعی موجودات کے دو اصل (جڑیں) ہیں، جیسے عقل اور نفس۔ اور ان سے تین فرعیں (شاخیں) ہیں: (جیسے) جدّ، فتح اور خیال، اور دو اصل خلقی جسمانی موجودات کے ہیں: جیسے آبا (واحد اب، باپ) اور اُمّہات (واحد اُمّ، ماں)، یعنی انجم و افلاک اور طبائع۔ اور ان سے بھی موالید تین ہیں: جیسے معادن، نبات اور حیوان، جس کا آخر انسان ہے۔ اور عالمِ صغیر میں دو اصل دین کے ہیں، جیسے رسول (ناطق) اور وصی (اساس) اور ان کی تین فرعیں امام حجّت اور داعی ہیں۔ اور ان موالید میں سے ہر مولود کی بہت شاخیں ہیں۔

۵۔ پس ابداعی فرشتے مجرد ہیں جن کا وجود اپنے فعل سے ہے اور ان کا فعل افلاک و کواکب میں نمایاں ہے، یعنی کہ افلاک و کواکب جو دیدنی اور ناشنودنی فرشتے ہیں کا نور اور قوّت ان ابداعی فرشتوں سے ہے اور خدا کی غرض ان خلقی اور دیدنی فرشتوں کے مقرر کرنے (تقدیر) سے انسانوں سے بالقوّہ فرشتوں کا حاصل کرنا ہے۔ جن کو رسول اور وصی کتاب و شریعت کے توسط سے (حدِ قوّت سے) حدِ فعل میں لاتے ہیں اور جس طرح ستارے جو کہ

دیدنی فرشتے ہیں، بالقوّہ فرشتوں کو پیدا کرنے کے لئے ابداعی فرشتوں جو کہ بالفعل ہیں اور انسانوں کے درمیان جو بالقوّہ فرشتے ہیں واسطہ ہیں، اسی طرح انبیاء، اوصیاء و ائمہ بھی بالقوّہ فرشتے جو انسان ہیں اور بالفعل فرشتوں جو کہ اوّلی و ابداعی (فرشتے) ہیں، کے درمیان واسطہ ہیں تاکہ کتاب و شریعت کے توسط سے ان کو بالفعل بنا دیں۔ اور جو بالقوّہ فرشتے کو حدِ فعل میں لا سکتا ہے وہ مرتبۂ فرشتگی تک پہنچا ہوا ہوتا ہے اور وہ زمین میں خدا کا خلیفہ (جانشین) ہوتا ہے، جیسا کہ خدا فرماتا ہے: قولہ "ولو نشاء لجعلنا منکم ملائکۃ فی الارض یخلفون (۴۳/۶۰) (اور اگر ہم چاہتے تو تم میں سے (منتخب کر کے) فرشتے بناتے اور وہ زمین پر (آدم کی) خلافت کرتے)"۔ یہی سبب تھا کہ خدا نے اپنے اوپر ایمان لانے کے بعد اپنے فرشتوں، کتابوں اور پیغمبروں پر بھی ایمان لانے کے لئے فرمایا، جیسے کہ اس نے کہا: قولہ "والمؤمنون کلّ آمن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ (۲/۲۸۵) (اور مؤمنین نے بھی ایمان لایا۔ سب نے خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لایا)"۔

۶۔ اور خدا تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے دو گروہوں کو یاد کیا ہے کہ "اپنی پرستش کے لئے پیدا کیا"۔ ان میں ایک جنّ کو یاد کیا جس کو فارسی میں "پری" کہتے ہیں اور دوسرے انسؔ یعنی

آدمی کو، جیساکہ فرمایا: قولہ "وما خلقت الجنّ والانس الّا لیعبدون (۵۱:۵۶)" (اور میں نے پریوں اور آدمیوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا)۔" اور نہیں فرمایا کہ "میں نے دیو کو پیدا کیا" بلکہ فرمایا کہ "دیو پری تھے، پس انھوں نے نافرمانی کی اور اپنے خدا کی نافرمانی کی وجہ سے دیو بن گئے"، جیساکہ اس آیت سے ظاہر ہے: قولہ "واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم، فسجدوا الّا ابلیس کان من الجنّ ففسق عن امر ربّہ (۱۸:۵۰) اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا (جو) پریوں میں سے تھا اور پھر اپنے پروردگار کے فرمان سے نکل بھاگا۔" اس آیت کے مطابق دیو کے وجود کا سبب انسان کا وجود ہے۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ: ابلیس کو آدم کی فرمانبرداری کا حکم دینے سے پہلے وہ پریوں میں سے تھا۔ پس مخلوق کی دو قسمیں ہوئیں: ایک انسان کی اور دوسری پری کی۔ اور پری کی بھی دو قسمیں ہوئیں: ایک فرشتہ کی اور دوسری دیو کی، یعنی پریوں میں سے جو فرمانبرداری پر (ثابت قدم) رہا وہ فرشتہ ہوگیا اور جو نافرمان ہو وہ دیو بن گیا۔ اور خدا نے اپنی کتاب میں فرشتہ و پری میں کوئی فرق نہیں کیا سوائے اس کے جو فرمایا کہ: جب پری نافرمان ہوگیا تو دیو بن گیا، نہیں تو فرشتہ و پری کو ایک ہی مرتبے میں رکھا ہے، جیساکہ اس آیت

ISW LS Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science Knowledge for a united humanity

سے ظاہر ہے: قولہ "واذقلنا للملائکۃ اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس کان من الجن" (۱۸/۵۰) یعنی خدا فرماتا ہے کہ "جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے جو پریوں یعنی فرشتوں میں سے تھا"۔ پس اس آیت سے ظاہر ہے کہ وہ پری تھا اور پریوں میں سے جو نافرمان نہیں ہوا وہ فرشتہ ہو گیا، جس طرح جو نافرمان ہو گیا وہ دیو بن گیا۔ پس ظاہر ہوا کہ پری کے فرشتہ بننے کا سبب فرمانبرداری ہے اور دیو بننے کا سبب نافرمانی اور خدا کی فرمانبرداری و نافرمانی رسول کی وساطت کے بغیر نہیں ہوتی ہے، جیساکہ آدم کے قصے میں فرماتا ہے کہ: جب ابلیس نے خدا کی نافرمانی کی تو فرشتہ ہونے کے بعد وہ دیو بن گیا۔

۷۔ پس یہ ضروری ہے کہ رسول پری اور انسان دونوں کی طرف رسول ہو، جیساکہ خدا اپنی کتاب میں فرماتا ہے: قولہ "قل اوحی الیّ انہ استمع نفر من الجن فقالوا انا سمعنا قرآنا عجبا یھدی الی الرشد" (۷۲/۱-۲) (کہہ دو کہ میرے پاس وحی آئی ہے کہ پریوں کی ایک جماعت نے (قرآن کو) جی لگا کر سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو بھلائی کی راہ دکھاتا ہے)۔ دوسری جگہ پر اپنے رسول سے فرمایا کہ "جب پریوں کے ایک گروہ کو تمھاری طرف بھیجا تاکہ قرآن کو غور سے

سُنیں۔ جب وہ حاضر ہوئے تو انہوں نے کہا غور سے سُنو، جب انھوں نے سُنا تو اپنی قوم کی طرف (ڈرانے والوں کی حیثیت سے) واپس ہو گئے اور کہا: ای ہماری قوم! خدا کے داعی کو قبول کرو"۔ جیسا کہ اس نے کہا: قولہ "واذ صرفنا الیک نفراً من الجن یستمعون القرآن فلما حضروہ قالوا انصتوا۔ فلما قضی ولوا الی قومھم منذرین (۴۶/۲۹)" اور دوسری جگہ پر فرمایا "کہو! اے لوگو! میں خدا کا رسول ہوں تم سب کی طرف (جمیعاً)" یعنی انسانوں اور پریوں کی طرف۔ اور لفظ "جمیعاً" پری کو انسان کے ساتھ ملا دیتا ہے۔ اور یہ لفظ اس پر دلیل ہے کہ پری انسانوں میں سے ہے، جب وہ فرماتا ہے کہ "کہو! اے لوگو! میں خدا کا پیغمبر ہوں تم دونوں کی طرف" یعنی انسان اور پری، قولہ "قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً" (۷/۱۵۸) نیز سورۂ الرحمٰن میں عتاب کے طور پر اکتیس جگہوں پر فرماتا ہے "ای انسانو اور پریو! تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے پیغمبر کو جھٹلاؤ گے؟" قولہ "فبای آلاء ربکما تکذبان (اے آدمیو اور پریو! تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں سے انکار کرو گے)"۔ پس ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ پیغمبر آدمیوں کی طرف بھی پیغمبر تھے اور پریوں کی طرف بھی۔

۸۔ اور یہ جاننا ضروری ہے کہ عالمِ دین میں انسان کے دو گروہ ہیں: ایک پریوں کا گروہ اور دوسرا آدمیوں کا۔ اور پریوں کے بھی دو گروہ ہیں کہ ان میں سے جو فرمانبرداری پر قائم رہا وہ فرشتہ بن کر اس عالم سے گزر جاتا ہے، اور جو فرمانبرداری سے منہ موڑ دے تو وہ دیو بن کر اس عالم سے باہر جاتا ہے، اور عام لوگوں کے نزدیک یہ مشہور ہے کہ پری خوبصورت ہے اور دیو بدصورت۔ اور چونکہ دیو کی بدصورتی نافرمانی کی وجہ سے ہے، اس لئے پری کی خوبصورتی فرمانبرداری سے ہونا لازمی ہے۔ اور یہ خوبصورتی و بدصورتی اعتقاد کی وجہ سے ہے، جو کہ روحانی ہے نہ کہ جسمانی۔ اور عام لوگوں کے ہاں پریاں لوگوں سے پنہان ہیں۔ اور پری کا نام عربی میں "جنّ" ہے، جس کے معنی پوشیدہ یا چھپے ہوئے کے ہیں۔ پس ظاہر ہوا کہ رسول کی اُمّت میں سے کچھ پوشیدہ ہیں اور کچھ آشکار ہیں، اور جو پوشیدہ ہیں وہ حدِ قوّت میں فرشتے ہیں: ان میں سے جو فرمانبرداری کے ساتھ اس عالم سے باہر جاتا ہے وہ حدِ فعل میں فرشتہ بن جاتا ہے، اور جو فرمانبرداری سے پھر جاتا ہے وہ حدِ قوّت میں دیو ہو جاتا ہے، اور (اسی حالت میں) دنیا سے نکل جائے تو حدِ فعل میں دیو ہو جاتا ہے۔ اور وہ جو آشکارا ہیں وہ حدِ قوّت میں پریاں ہیں اور جب تک وہ حدِ فعل میں پری نہ ہو جائیں تو حدِ قوت میں فرشتہ نہیں ہوتے ہیں، اور جو حدِ قوّت میں

فرشتہ نہ ہو تو حدِ فعل میں فرشتہ نہیں ہوتا۔ پس اس گروہ میں سے جو آشکارا ہے، جو پری ہو جاتا ہے وہ ان دوسروں سے پنہان ہو جاتا ہے تاکہ پری ہو کر فرشتہ بنے۔ اور یہ جو کچھ ہم نے کہا وہ ایک مثال ہے اہلِ ظاہر و باطن کی، کہ جو ظاہر سے باطن میں آتا ہے ایسا ہے کہ آدمی پری ہو جائے اور خوبصورت ہو جائے۔

۹۔ اور پیغمبر کے نزدیک ان دونوں اُمتّوں میں سے دیو ہیں، یعنی وہ جو حدِ پنہانی سے پھر جاتے ہیں دیوانِ جنّی کی طرح ہیں، اور وہ جو پوشیدگی کی حد میں آنے کے لئے آشکارگی (کی حد) سے پھر جاتے ہیں وہ دیوانِ انسی کی طرح ہیں، جیسا کہ خدا نے فرمایا: قولہ "وکذٰلک جعلنا لکلّ نبیٍّ عَدُوًّا شیاطینَ الاِنس والجنّ (۶/۱۱۲) (اور اسی طرح ہم نے انسی اور جنّی دیووُں کو ہر نبی کے لئے دشمن بنایا"

۱۰۔ اور ہم کہتے ہیں کہ نفسِ ناطقہ ہر انسان میں بالقوّہ فرشتہ ہے، اور بالقوّہ فرشتہ پری ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔ اور نفسِ شہوانی (یعنی خواہشات والی روح)، اور نفسِ غضبی (یعنی غضب رکھنے والی روح) ہر ایک انسان میں دو بالقوّہ دیو ہیں۔ ہر وہ شخص جس کا نفسِ ناطقہ نفسِ غضبی اور شہوانی کو اپنی فرمانبرداری میں لائے تو وہ فرشتہ ہو جاتا ہے اور ہر وہ شخص جس کے نفسِ شہوانی اور نفسِ غضبی نفسِ ناطقہ کو اپنی فرمانبرداری میں لائیں تو وہ

بالفعل دیو بن جاتا ہے۔ اور رسول مصطفےٰؐ نے فرمایا کہ انسان کے دو دیو ہیں جو اس کو دھوکہ دیتے ہیں، جیسا کہ اس حدیث میں ہے: "لِکُلِّ انسانٍ شیطانان یُغْوِیانہ (ہر انسان کے دو دیو ہیں جو اسے گمراہ کر دیتے ہیں)" اس حدیث میں ظاہر ہے کہ انسان نفسِ ناطقہ ہے جو ایک ہے اور اس کے دیو دو ہیں: ایک نفسِ شہوانی اور دوسرا نفسِ غضبی۔ پھر رسول سے پوچھا گیا کہ "اے پیغمبر! کیا تمھارے بھی یہ دو دیو ہیں؟" آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "میرے بھی دو دیو تھے لیکن خدا نے میری نصرت فرمائی اور میں نے ان کو مسلمان بنایا۔" اور حدیث کے الفاظ جو آنحضرت نے فرمائے، یہ ہیں: حدیث "کانا لی شیطانان و لکن نصرنی اللہ علیھما فأسلما (میرے دو دیو تھے لیکن خدا نے مجھے ان دونوں پر نصرت بخشی اور وہ دونوں مسلمان ہو گئے)" پس ہم نے ظاہر کر دیا کہ انسان میں فرشتہ (بھی) ہے اور دیو (بھی) اور وہ خود پری ہے۔ دیو خدا کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے بلکہ اس کا وجود اپنی نافرمانی کی وجہ سے ہے اور پری حدِ قوّت میں فرشتے ہیں اور جب وہ فرمانبرداری (کے راستے پر) چلتے ہیں تو وہ حدِ فعل میں آتے ہیں اور دیو بھی حدِ فعل میں آتے ہیں جب وہ نافرمانی (کے راستے پر) چلتے ہیں۔ اور انسان بالقوہ فرشتے اور دیو ہیں اور وہ عالم بالفعل

فرشتوں اور دیوؤں سے بھرا ہوا ہے اور یہ ایک مفصل اور مشروح بیان ہے۔

ترجمہ از کتاب جامع الحکمتین، سیدنا حکیم پیر ناصر خسرو قدس سرہ

فقیر محمد ھونزائی، لنڈن
۱۱ر جولائی ۱۹۹۱ء

Institute for Spiritual Wisdom and Luminous Science
Knowledge for a united humanity

Table of Contents

YAAD-GAAR

50
PAC̄AAS-SAALAH
(NISF --- SADI)
(1940-1990)

"BURUŚASKI"
ZABAAN--KII
QHIDMET